رنگون سے فرار
اے حمید
Millat.com

رنگون سے فرار

اے حمید

برما پر جاپانی قبضے کے بعد رنگون سے
کلکتے تک پیدل سفر کی ہولناک سچی
داستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

پہلا ایڈیشن : اگست 1996ء

تعداد : ایک ہزار

کمپوزنگ : طیبہ کمپوزنگ پوائنٹ

ناشر: غالب پبلشرز۔ پوسٹ بکس 9111۔لاہور

طابع : منظور پریس 'لاہور

ہول سیل ایجنٹ : الفیصل ناشران وتاجران کتب 'غزنی
سٹریٹ 'اردو بازار 'لاہور

قیمت : 200روپے صرف

انتساب

عفت زہرا رضوی کے نام

رنگون کا سفر میری زندگی کا سب سے بھیانک سفر تھا۔

آج بھی جب میں اسے یاد کرتا ہوں تو ایک بار تو میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ میں زندہ کیسے بچ گیا۔ اگر خدا نے میری زندگی نہ لکھی ہوتی تو یقین کریں کہ میں یہ سفرنامہ لکھنے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ رنگون کے سفر کی کچھ خوشگوار اور رومانوی یادیں بھی ہیں۔ یعنی عشق و محبت کی یادیں۔ میں محبت کا آدمی ہوں۔ بنیادی طور پر رومان پرست ہوں۔ اپنی سیاحتوں بلکہ آوارہ گردیوں کے زمانے میں جس ملک میں بھی گیا۔ جس شہر میں بھی گیا' وہاں کسی نہ کسی لڑکی سے مجھے محبت ضرور ہو جاتی تھی۔ ان محبتوں نے مجھے غم دیئے' اداسیاں دیں اور بے پناہ خوشیاں بھی دیں۔ میں آپ سے اپنے غم چھپاؤں گا' نہ خوشیاں۔ ہاں جن لڑکیوں سے میں نے محبتیں کیں' ان کے اصلی نام نہیں لکھوں گا' اگرچہ آج وہ لڑکیاں نانیاں بن چکی ہوں گی مگر میرا ضمیر اخلاقی طور پر مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں ان کے اصلی نام لکھوں۔

میں کوئی افسانہ نہیں لکھ رہا' کسی ناول کی فرضی کہانی نہیں لکھ رہا' سفر نامہ لکھ رہا ہوں اور سفرنامے میں اگر ہر بات پوری سچائی کے ساتھ بیان نہ کی جائے تو وہ سفرنامہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے پڑھا جائے۔ میں نے سفرناموں

میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ناول اور افسانوں میں فرضی کردار اور فرضی رومان ضرور ڈال دیتا ہوں مگر سفرناموں میں، میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ سچ لکھا ہے خواہ مجھے کوئی برا آدمی سمجھے، خواہ اچھا آدمی سمجھے۔ دوسروں کی کمزوریاں لکھی ہیں تو اپنی برائیاں بھی بیان کر دی ہیں۔ رنگون کی سیاحت اور برما کے اس حسین اور خوب صورت شہر میں اپنے قیام کے دوران میں نے انسان کو زندگی کی انتہائی اعلیٰ قدروں کے ساتھ ہم آہنگ دیکھا اور اسے درندگی اور حیوانیت کی انتہائی پستیوں میں گرتے بھی دیکھا۔ پرانی نسل کو تو ضرور معلوم ہو گا مگر نئی نسل کو شاید معلوم نہ ہو کہ رنگون میں پاکستان بننے سے پہلے برصغیر کے ہندوستانیوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ یہ لوگ برما کے کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں ہندوستان کے ہر صوبے کے لوگ تھے۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے مسلمان بھی بھاری تعداد میں سال ہا سال سے آباد چلے آرہے تھے۔ یہ مسلمان برما کے سرکاری محکموں میں بھی ملازم تھے اور اپنا نجی کاروبار بھی کرتے تھے۔ ان مسلمانوں کی رنگون کی مارکیٹوں میں بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ آڑھت کا بزنس تھا۔ کئی سکولوں میں اردو زبان پڑھائی جاتی تھی۔ رنگون شہر سے اردو کے دو اخبار روزانہ شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے ایک اخبار کا نام ''شیر رنگون'' تھا اور دوسرے کا نام ''مجاہد برما'' تھا۔ ان دونوں اخباروں کے مالک ہمارے سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر صاحب کے والد گرامی سید کشفی شاہ صاحب تھے۔ جب جاپان کی فوجیں برما میں داخل ہوئیں اور ان کے بمبار طیاروں نے رنگون پر اندھا دھند بمباری کی تو اس وقت ان اخباروں کے ایڈیٹر پاکستان کے نامور صحافی باری علیگ تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ رنگون میں مقیم تھے اور جب رنگون سے برما کے جنگلوں کی

طرف ہندوستانیوں کے پیدل قافلے ایک اذیت ناک بھیانک سفر پر روانہ ہوئے تو باری علیگ صاحب بھی اپنی فیملی کے ساتھ اس قافلے میں شامل تھے۔

سانپوں، بچھوؤں، شیروں، ہاتھیوں، خون پی جانے والی جونکوں اور درندہ صفت برمی ڈاکوؤں سے بھرے ہوئے برما کے خطرناک اور دشوار گذار جنگلوں میں لاکھوں انسانوں کے بے یار و مددگار قافلے کے اس بھیانک سفر کے واقعات میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہ واقعات اس لئے سچے ہوں گے کہ میں خود بھی اس قافلے میں شامل تھا۔ برما کے خوفناک جنگلوں میں بے یار و مددگار مسلمان عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کے اس قیامت خیز سفر کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ اگر کہیں کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو وہ جھوٹ لکھا ہے۔ کیونکہ لکھنے والے نے کچھ ادھر ادھر کی باتیں سن کر اور کچھ اپنی طرف سے من گھڑت واقعات شامل کر دیئے ہیں اور یوں اس ہولناک سفر کے حقائق کو مسخ کر دیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے اپنے مضمون میں رنگون کے آخری دنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب ہم رنگون کی بندرگاہ سے افراتفری کی حالت میں آخری سمندری جہاز میں سوار ہو کر چلے تو سمندر بڑا پر سکون تھا۔ یا جب ہمارا جہاز سمندر میں روانہ ہوا تو رنگون کی عمارتیں دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ ان صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں تھا اور نہ انہوں نے کسی سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ رنگون میں سمندر نہیں ہے۔ رنگون کی بندرگاہ یا جیٹی دریائے اراوتی پر واقع ہے اور مسافر جب رنگون سے جہاز پر سوار ہوتا ہے تو جہاز سارا دن ساری رات دریائے اراوتی میں سفر کرنے کے بعد خلیج بنگال کے کالے پانیوں والے سمندر میں داخل ہوتا ہے۔

ایک اور صاحب نے اپنے من گھڑت سفرنامے میں لکھا کہ رنگون پر ایک بھی بم گرائے بغیر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بھی بالکل غلط بات ہے۔ کیونکہ جس وقت جاپانی بمبار طیارے رنگون شہر پر بم گرا رہے تھے تو میں اس وقت رنگون میں موجود تھا۔ جاپانیوں کے بمبار جہاز بالکل سفید رنگ کے تھے۔ شاید المونیم کے تھے' کیونکہ دھوپ میں وہ چمک رہے تھے۔ یہ بمبار طیارے (V) وی کی شکل کی تین ٹکڑیوں میں دن کی روشنی میں رنگون کے آسمان پر نمودار ہوتے تھے اور سب سے پہلے انہوں نے رنگون کی بندرگاہ یعنی جیٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس وقت بندرگاہ پر ایک تیل بردار جہاز کھڑا تھا۔ ایک بم اس جہاز پر گرا اور جہاز میں آگ لگ گئی۔ اس جہاز میں سے آگ لگ جانے کے بعد اتنا دھواں اٹھا تھا کہ رنگون شہر پر جیسے شام پڑ گئی تھی۔ میں اس وقت میکسم سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر تھا۔ پھر جاپانی جہازوں نے شہر پر بم گرانے شروع کر دیئے۔ سٹریٹ نمبر ۹ کی تقریباً ساری بلڈنگیں مسمار ہو گئیں اور خلیل نامی ایک سرکاری ملازم اپنے بال بچوں سمیت ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ ساری باتیں میں تاریخ وار آگے چل کر بیان کروں گا۔ ابھی تو میں صرف ان واقعات کی نشان دہی کر رہا ہوں جن کے متعلق ہمارے چند ادیب غلط بیانیوں سے کام لے رہے ہیں۔ رنگون کی تباہی کے حادثہ جانکاہ کے عینی شاہد ابھی زندہ ہیں اور وہ میرے لکھے ہوئے واقعات کی تائید کریں گے۔ پاکستان میں اور خاص طور پر کراچی' پنجاب اور صوبہ سرحد میں وہ بزرگ ابھی بقید حیات ہیں جن کا رنگون میں بہت وسیع کاروبار تھا اور جو اپنا سب کچھ لٹا کر بمشکل جانیں بچا کر اپنے بال بچوں کے ساتھ برما کے خطرناک جنگلوں میں پیدل سفر کرتے ہوئے کاکسز بازار (بنگال) پہنچے تھے۔ ان میں

پشاور کے حاجی رحیم صاحب تھے جو خود تو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں مگر ان کے بچے پشاور میں کاروبار کرتے ہیں اور ان کے خط کبھی کبھی مجھے آجاتے ہیں۔ اس طرح آپ نے گجرات کی مشہور فرم باسکو کا نام بھی سنا ہو گا۔ یہ بشیر آف کمائیٹ نے گجرات میں قائم کی تھی۔ بشیر صاحب بھی رنگون میں تھے اور رنگون کی ایک مضافاتی بستی کمائیٹ میں ان کی بڑی خوبصورت کوٹھی تھی اور کوٹھی کے ساتھ ہی ربڑ کے جوتوں کا ایک کارخانہ بھی تھا۔ میں یہاں اکثر جایا کرتا تھا۔

اب میں اپنے سفرنامے کی طرف آتا ہوں۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ یہ زمانہ کونسا تھا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے شروع کا زمانہ تھا۔ یعنی سن 1941ء تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی مگر یہ جنگ ابھی تک یورپ میں لڑی جا رہی تھی۔ ہندوستان اور برما پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریز یورپ میں ہٹلر کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوستان اور برما میں اس جنگ کے اثرات صرف جنگی ساز و سامان کی تیاریوں تک ہی محدود تھے۔ رنگون میں رات کو بلیک آؤٹ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ جنگ رنگون سے بہت دور تھی۔ ہندوستان کے فوجی ٹھیکیداروں کی طرح برما کے ملٹری کنٹریکٹر بھی فوج کا سامان مثلاً ترپالیں، بیلچے اور دوسرا جو بھی کوئی چھوٹا موٹا سامان تھا، فیکٹریوں میں تیار کروا کر انگلستان بھجوا رہے تھے، اور بڑا روپیہ کما رہے تھے۔ یہ کام زیادہ تر ہندوستانی کرتے تھے جن میں رنگون کے پنجابی مسلمان صنعت کاروں کی بھی خاصی تعداد شامل تھی۔

میں جب کلکتے کی خضر پور جیٹی سے بحری جہاز میں سوار ہو کر رنگون کی طرف روانہ ہوا تو خلیج بنگال یعنی کالے پانی کا سمندر پر سکون تھا۔ رات کو جہاز میں کوئی بلیک آؤٹ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ رنگون میں بھی زندگی

اپنی پوری گہما گہمی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ کسی کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ جنگ کے شعلے ان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔

لیکن میں اپنا سفرنامہ اس سے بھی ذرا پہلے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آخر میں اپنے شہر کو چھوڑ کر اتنی دور سمندر پار کے ملک رنگون کی جانب کیوں روانہ ہوا۔ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ابھی پوری طرح سے ڈاڑھی مونچھیں بھی نہیں آئی تھیں۔ میرا کوئی کاروبار بھی نہیں تھا۔ مجھے رنگون کی کسی فرم نے بھی نہیں بلایا تھا۔ تو پھر ایسی کونسی مصیبت آن پڑی تھی کہ میں اپنی سکول کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر میں کسی کو بتائے بغیر اتنے طویل سفر پر چل پڑا تھا۔ یقیناً اس میں میری طبعی آوارہ گردی کو بھی دخل تھا مگر جس چیز نے مجھے رنگون کی طرف دھکا دیا' وہ ایک لڑکی سے میرا عشق تھا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ میں اس لڑکی کا اصلی نام یہاں نہیں لکھوں گا۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ لاہور کے کس محلے' محلے کی کس گلی میں اسکا کونسا مکان تھا۔ لیکن اتنا ضرور لکھوں گا کہ جس گلی میں میری محبوبہ کا مکان تھا' اسی گلی میں ہمارا مکان بھی تھا۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اور نسواری رنگ کا ریشمی برقعہ پہنا کرتی تھی۔ اس برقعے کا اوپر کا حصہ الگ ہوتا تھا اور نیچے کا حصہ الگ ہوتا تھا۔ وہ جب گلی میں سے گذرتی تو برقعے کے نقاب کی جالی میں سے مجھے اس کی چمکیلی آنکھیں نظر آیا کرتی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ یہ آنکھیں مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ہمارے گھر میں بھی میری بڑی بہنوں سے ملنے کے بہانے آجاتی تھی۔ اصل میں وہ مجھے ملنے آتی تھی۔ اس وقت میں اس کے

قریب رہنے کی کوشش کرتا اور سب کی نظریں بچاکر اشاروں میں اس سے باتیں بھی کیاکرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ وہ ہمارے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوکر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ آدھی سیڑھیوں میں ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوگئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کا بھی سانس پھول رہا تھا حالانکہ اس نے تین چار سیڑھیاں ہی چڑھی تھیں اور وہ سولہ سترہ برس کی نوجوان صحت مند لڑکی تھی۔ مگر جذبات محبت کی شدت سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اچانک اوپر سے کسی نے آواز دی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا اور میرے قریب سے ہوکر دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر گلی میں آگیا۔ وہ سکول جاتی تو میں کبھی اس کے پیچھے نہ گیا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے سے منع کیا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اسکا کوئی نام رکھ لیتا ہوں۔ چلئے یوں سمجھ لیں کہ اسکا نام زاہدہ تھا۔ ہمارے مکان تقریبا آمنے سامنے ہی تھے۔ میں چھت پر پتنگ اڑاتا تو وہ بھی کسی بہانے چھت پر آجاتی۔ میں پتنگ تیزی سے اس کے سر کے اوپر سے گذارتا۔ وہ دور سے ہنس کر ہاتھ ہلاتی۔ ہماری آپس کی ملاقاتیں بس مکان کی سیڑھیوں اور نیم تاریک ڈیوڑھیوں تک ہی محدود تھیں۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو ہوٹلوں میں لے جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر اس زمانے میں آج کل کی طرح کے ہوٹل بھی نہیں ہوتے تھے۔ انگریزی طرز کے بنے ہوئے بڑے بڑے ہوٹل ہوتے تھے جن میں رات بسر کرنے کے

لئے بڑے مہنگے کمرے تھے اور ہم یہی سمجھا کرتے تھے کہ وہاں انگریز ہی آکر ٹھہرتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے کو رقعے بھی لکھا کرتے تھے۔ جس وقت زاہدہ اپنے مکان کی چھت پر گیلے کپڑے ڈال رہی ہوتی تو میں رقعہ ڈور کی کانٹی کے ساتھ باندھ کر کانٹی کو زور سے گھماتا اور اس کی چھت پر پھینک دیتا۔ زاہدہ جلدی سے رقعہ توڑ لیتی اور میں ڈور واپس کھینچ لیتا۔ زاہدہ رقعہ اپنے گریبان کے اندر ٹھونس لیتی اور نیچے جاکر پڑھتی۔ پھر وہ اس کے جواب میں رقعہ لکھ کر کسی بچے کے ہاتھ مجھے بھجواتی۔ یا کسی بہانے ہمارے گھر میری بڑی بہنوں سے ملنے آتی تو رقعہ کاغذ میں لپیٹ کر کاغذ کی گولی سی بنا کر ساتھ لاتی۔ موقع دیکھ کر وہ کاغذ کی گولی میری طرف پھینک دیتی۔ میں کسی کونے میں چھپ کر اسکا رقعہ پڑھتا اور بڑا خوش ہوتا۔ ایک دفعہ میں نے زاہدہ کو رقعے میں لکھا کہ چلو باہر لارنس گارڈن چل کر ملتے ہیں۔ اس زمانے میں ابھی پاکستان نہیں بنا تھا اور باغ جناح کا نام ابھی لارنس گارڈن ہی تھا۔ زاہدہ نے جواب میں لکھا کہ میں لارنس گارڈن نہیں جاؤں گی۔ بھائیوں نے مجھے دیکھ لیا تو مجھے ماریں گے۔ دو دن بعد اتفاق سے ہمارے مکان کی سیڑھیوں میں میری اور زاہدہ کی مڈ بھیڑ ہوگئی۔ میں نے زاہدہ کا ہاتھ چوم لیا۔ اس زمانے کی محبتیں بڑی معصوم اور پاک محبتیں ہوا کرتی تھیں۔ یا کم از کم میری محبتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ کسی لڑکی کو خراب کرنے کا کبھی میرے ذہن میں تصور بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے زاہدہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکتا مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا:

"زاہدہ! چلو کہیں باہر ملتے ہیں۔"

وہ بولی: "نہیں، نہیں۔ میں باہر نہیں مل سکتی۔"

میں نے کہا: "اچھا تم کل سکول سے چھٹی کے بعد ریلوے لائن پر آجانا۔ ہم وہاں لائن کے پاس کھیتوں میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

اس نے اپنا آپ پیچھے کرتے ہوئے کہا:

"میں نہیں آسکتی۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

میں نے غصے سے کہا:

"تو چلو پھر قبرستان آجانا۔ وہاں تو ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا ناں۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ زاہدہ نے فوراً کہا:

"ہاں میں قبرستان آجاؤں گی۔ کل گیارہ بجے۔"

اور وہ اپنا آپ چھڑا کر جلدی سے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

ہمارے محلے کے باہر کچھ فاصلے پر ریلوے لائن گذرتی تھی۔ اس کی دوسری طرف ایک پرانا اور کافی وسیع قبرستان تھا۔ یہ قبرستان آج بھی موجود ہے۔ اسکا ایک ہی راستہ تھا جو نانک شاہی پرانی اینٹوں کے محراب، نما شکستہ دروازے میں سے ہوکر گذرتا تھا۔

میں دوسرے دن دس بجے ہی قبرستان پہنچ گیا اور دروازے کے اردگرد منڈلانے لگا۔ زاہدہ کو سکول سے بارہ بجے چھٹی ہوتی تھی۔ پورے گیارہ بجے مجھے ریلوے لائن پر ایک نسواری برقعے والی لڑکی نظر آئی جو لائن پار کر کے ڈھلان پر اتر رہی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ زاہدہ ہی تھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ قبرستان کی طرف ہی آرہی تھی۔ میں دوڑ کر قبرستان کے دروازے میں سے گذرتا ہوا بائیں جانب کیکر کے درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد زاہدہ قبرستان کے

دروازے میں سے اندر کی جانب آئی۔ ایک جگہ رک کر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ میں فوراً درخت کی اوٹ میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ زاہدہ نے مجھے آہستہ سے دھکیلتے ہوئے کہا:

"یہاں کوئی دیکھ لے گا۔ اس طرف چلو۔"

میں نے دوسری طرف چلتے ہوئے کہا:

"یہاں ہمیں کون دیکھے گا زاہدہ۔ تم یونہی گھبرا رہی ہو۔"

ہم قبروں کے درمیان سے گذر رہے تھے۔ ایک جگہ زاہدہ نے میرے بازو کو نیچے کھینچتے ہوئے کہا:

"بس یہیں بیٹھ جاؤ۔ مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔ جو باتیں کرنی ہیں، جلدی سے کر لو۔"

ہم دو بڑی قبروں کے درمیان کچی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دونوں قبروں پر گلاب کی تازہ پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسی روز وہاں کسی نے پھولوں کی پتیاں ڈالی ہیں۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"نقاب اٹھالو۔ میں تمہیں جی بھر کر قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

زاہدہ نے کہا:

"ناں بابا ناں۔ میں نقاب نہیں اٹھاؤں گی۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

میں نے کہا:

"زاہدہ! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہاں سوائے میرے تمہیں اور کوئی نہیں دیکھے گا۔"

مگر زاہدہ کسی طرح نقاب الٹنے پر راضی نہ ہوئی۔ کہنے لگی:

"بس تم جلدی جلدی جو باتیں کرنی ہیں کر لو۔ میں اسکول سے بڑی مشکل سے چھٹی کر کے آئی ہوں۔ پانچ منٹ بعد واپس چلی جاؤں گی۔"

ہمارے قریب ہی ایک درخت اگا ہوا تھا جس کی شاخیں ہم پر اور وہاں پر جو قبریں تھیں' ان پر جھکی ہوئی تھیں۔ مارچ' اپریل کے دن تھے۔ نہ گرمی تھی' نہ سردی تھی۔ میں نے اپنی روائتی جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا کر برقعے کے اندر سے زاہدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کی چوڑیاں کھنکھنائیں۔

"ناں بابا ناں۔۔۔ میرا ہاتھ نہ پکڑنا۔"

میں نے ابھی کوئی بات بھی نہ کی تھی کہ زاہدہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کوئی ادھر آرہا ہے۔"

دو عورتیں جن کے ساتھ ایک مرد بھی تھا' پھولوں کے ہار لئے دوسری طرف قبروں کے درمیان چل رہے تھے۔ میں نے کہا:

"وہ اپنے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہیں۔ ہماری طرف نہیں آرہے۔"

زاہدہ بولی:

"نہیں' نہیں۔ بس اب میں جاتی ہوں۔ تم میرے ساتھ نہ چلنا۔ جب میں قبرستان سے نکل جاؤں تو دوسری طرف سے آجانا۔"

میں نے ایک قدم ساتھ چلتے ہوئے پوچھا:

"پھر کب ملو گی؟"

"مجھے نہیں پتہ۔۔۔ خدا کے لئے میرے ساتھ ساتھ نہ چلو۔"

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور قبروں کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے زاہدہ کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ کوئی چار پانچ منٹ گزر جانے پر میں نے گردن گھما کر دیکھا تو زاہدہ نسواری برقعے میں لپٹی تیز تیز قدموں سے ریلوے لائن پار کر رہی تھی۔

ایک دفعہ لاہور میں سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی سردی پڑ رہی تھی۔ زاہدہ شام کے وقت ہمارے گھر میں آئی۔ اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا:

"زاہدہ آؤ' باورچی خانے میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

اس نے جب دیکھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو وہ گھبرا گئی۔ کہنے لگی:

"نہیں' نہیں۔۔ آپی آجائیں گی۔ میں جاتی ہوں۔"

میں نے کہا:

"پھر کب ملو گی؟"

جاتی دفعہ میرا زاہدہ سے یہی ایک سوال ہوا کرتا تھا۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا آئی' چلتے چلتے رک گئی۔ پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی:

"رات کے بارہ بجے ہمارے مکان پر آجانا۔"

میں تو حیران رہ گیا:

"تمہارے مکان پر؟ وہاں تمہارے گھر کے سارے لوگ ہوں گے"

"نہیں۔ سب جلدی سو جاتے ہیں۔ میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رکھوں گی۔ تم ٹھیک بارہ بجے ڈیوڑھی میں آکر سیدھا سیڑھیاں چڑھ کر مکان

کی چھت پر چلے جانا۔ میں خود ہی آجاؤں گی۔ خبردار اوپر چھت پر چلنا بالکل نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

میں حیران پریشان کھڑا سوچنے لگا کہ یہ بیوقوف لڑکی کیا کہہ گئی ہے۔ سردیوں کی رات کے بارہ بجے میں اس کے مکان کی چھت پر جاؤں گا۔ اگر اس کے گھر میں سے کوئی اوپر آگیا تو پھر کیا ہو گا؟ نہیں، نہیں۔۔ میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ سارا دن میں اسی شش و پنج میں رہا۔ کبھی فیصلہ کرتا کہ مجھے رات کو زاہدہ کے مکان کی چھت پر چلے جانا چاہئے۔ کبھی فیصلہ کرتا کہ نہیں، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ دونوں گھروں کی صرف بدنامی ہی نہیں ہو گی بلکہ دونوں گھروں میں ڈانگ سوٹا چل جائے گا۔ لیکن جب رات کے گیارہ بجے تو میرا ذہن مجھے دل آویز تصویر پیش کرنے لگا۔ میں زاہدہ کے پاس چھت پر بیٹھا ہوں۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہے۔ ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ میں زاہدہ کا ہاتھ چوم رہا ہوں۔ پھر اسکا منہ چوم رہا ہوں۔ میرے تصور میں زاہدہ کے بھرے بھرے سرخ آلوچوں ایسے ہونٹ آگئے۔ میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ میں آدھی رات کو زاہدہ سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ چاہے ڈانگ سوٹا چل جائے، چاہے گھر والے مجھے گھر سے نکال دیں۔ میں زاہدہ سے ملنے ضرور جاؤں گا، اور پھر زاہدہ نے خود ہی مجھے ملنے کی دعوت دی تھی۔ آخر اس نے کچھ سوچ کر ہی مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ یہ بات میری شان مردانگی کے خلاف ہو گی کہ میں رات کو اس سے ملنے نہ جاؤں۔ گیارہ بج چکے تھے۔

میں نیچے بیٹھک میں چارپائی پر لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ بجلی کا بلب میں نے بجھا دیا تھا۔ صرف ایک موم بتی جلا کر چھوٹی میز پر ٹائم پیس کے پاس رکھ دی تھی تاکہ مجھے وقت کا پتہ چلتا رہے کہ رات کا کیا بجا ہے۔ مجھے کوئی زیادہ دور تو جانا نہیں تھا۔ بس گلی پار کر کے زاہدہ کے مکان میں داخل ہو جانا تھا۔ جب گھڑی نے رات کے پورے بارہ بجائے تو میرا دل اپنے آپ زور سے دھڑکنے لگا۔ خیال آیا کہ جہاں میں جا رہا ہوں' وہاں مجھے نہیں جانا چاہیے۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ کوئی نہ کوئی ضرور چھت پر آ جائے گا۔ اور ہمیں دیکھ لے گا اور پھر وہاں کہرام مچ جائے گا۔ زاہدہ کے دونوں بھائی مل کر میری پٹائی شروع کر دیں گے۔ میری آواز سن کر میرے بھائی بھی آ جائیں گے اور وہاں جنگ شروع ہو جائے گی۔ میں نے لحاف اپنے اوپر کر لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں' زاہدہ کی مسکراتی ہوئی شکل اور آلوچوں ایسے ہونٹ سامنے آ گئے۔ میں نے جلدی سے لحاف ہٹا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ میں پانچ منٹ دیر سے بھی پہنچ سکتا تھا۔ مجھے کوئی فرنٹیئر میل نہیں پکڑنی تھی۔ لیکن جب میں فیصلہ کر چکا تھا تو پھر مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی۔

پورے بازوؤں کا سویٹر پہنا۔ گلے میں مفلر ڈالا۔ کینوس کے جوتے میں نے اسی مقصد کے لئے پہلے ہی نکال کر رکھ لئے تھے کیونکہ ان جوتوں کی آہٹ نہیں ہوتی۔

میں بیٹھک کا دروازہ کھول کر گلی میں آ گیا۔ دروازے کو آہستہ سے بند کر دیا۔ سامنے زاہدہ کے مکان کا دروازہ سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں

بند نظر آرہا تھا۔ کیا خبر دروازہ اندر سے بند ہو۔ مجھے خیال آیا' اگر دروازہ بند ہوا تو میں فوراً واپس آجاؤں گا۔ سردیوں کی رات میں گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ میرے اور زاہدہ کے مکان کے دروازے کے درمیان گلی کے چند قدم حائل تھے مگر مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے درمیان سات سمندروں کا فاصلہ تھا۔ آخر محبت کی فتح ہوئی۔ میں نے دوڑ کر گلی پار کی اور زاہدہ کے مکان کے دروازے کے ساتھ لگ کر بلکہ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں اس طرح زیادہ دیر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ چوکیدار آواز لگاتا گلی میں سے رات کو گذرا کرتا تھا۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا اندر کی طرف دھکیلا۔ زاہدہ نے دروازہ اندر سے کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس نے نہ جانے رات کو کس وقت نیچے آکر کنڈا کھول دیا تھا۔

دروازہ ذرا سا چرایا۔ میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کو اندر کی طرف دھکیلتا چلا گیا۔ جب دروازہ تھوڑا سا کھل گیا تو میں جلدی سے ڈیوڑھی میں گھس گیا اور دروازے کو اسی طرح بند کر دیا۔ ڈیوڑھی میں گھپ اندھیرا تھا مگر میں ڈیوڑھی اور ڈیوڑھی کے آگے سیڑھیوں کی ترتیب سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ہاتھ رکھ کر ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ یہ اس قسم کا مکان تھا کہ ڈیوڑھی میں سے سیڑھیاں اوپر چھت کے دروازے تک جاتی تھیں۔ درمیان میں دوسری منزل کا دروازہ بھی آتا تھا۔ میں دوسری منزل کے دروازے کے قریب سے اوپر جانے لگا تو یونہی کان بند دروازے کے ساتھ لگا دیا۔

دوسری منزل میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں زاہدہ بھی نہ سوگئی ہو۔ کہیں میں اکیلا مارا نہ جاؤں۔ مگر محبت کی منزل کا آدھا راستہ میں طے کرچکا تھا۔ منزل سامنے نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنے دل سے کہا:

"اب جو ہوتا ہے' ہوتا رہے۔ چلو اوپر۔"

اور میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت کے دروازے کے پاس آگیا۔ چھت کے دروازے کی بھی کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا تو ٹھنڈی سرد ہوا کے جھونکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ مگر ایک تو میری نوجوانی کی عمر تھی۔ اوپر سے دل محبت کے جذبوں سے معمور تھا۔ مجھے بالکل سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا چھت پر آگیا۔ دروازہ میں نے پیچھے آہستہ سے دوبارہ بند کردیا۔ یہ چھت میری دیکھی بھالی تھی۔ یہاں ایک طرف ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی جس کے نیچے ایک پرانا تخت پوش پڑا رہتا تھا۔ ٹین کی چھت کے اوپر ٹوٹی ہوئی کرسیاں' ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کا بان اور خدا جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا جو مجھے اپنے مکان کی چھت پر سے بھی دکھائی دیا کرتا تھا۔ میں دبے پاؤں چل کر تخت پوش کے کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے میں موت کے منہ میں آگیا تھا۔ مگر محبت اور نوجوانی کی بے دھڑک عمر۔۔۔۔ میں یوں بیٹھا تھا جیسے کسی باغ میں بیٹھا ہوں۔ یقین کریں گلی میں اور سیڑھیوں میں مجھے جو گھبراہٹ تھی' وہ چھت پر آکر یا موت کے منہ میں آکر بالکل غائب ہوگئی تھی۔ میرا خیال ہے مجھے وہاں بغلوں میں ہاتھ دے کر بیٹھے بمشکل دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کی دھندلی سلیٹی رنگ کی روشنی

میں مجھے سیڑھیوں کا دروازہ آہستہ سے کھلتا نظر آیا۔ پھر ایک انسانی ہیولا چھت پر آگیا۔

یہ زاہدہ تھی جس نے اپنے سارے جسم کو گرم کشمیری شال میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر بھی گرم شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ہرنی کی طرح دبے پاؤں مگر تیزی سے تین چار قدم چل کر میرے پاس آکر تخت پوش پر بیٹھ گئی۔ اس کی شال میں سے حنا کے عطر کی گرم خوشبو آرہی تھی۔ سرگوشی میں کہنے لگی:

"تم نے بڑی بہادری کی ہے۔"

میں نے کہا:

"تمہاری محبت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔"

زاہدہ نے اپنا چہرہ میرے کان کے قریب لاکر کہا:

"سب سو رہے ہیں۔"

مجھے اس کے سانس میں سے الائچی کی خوشبو آئی۔ میں نے کہا:

"تم الائچی کھا رہی ہو؟"

زاہدہ نے شال میں سے اپنا گرم ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ میں ایک دو الائچیاں پکڑا دیں اور کہا:

"لو تم بھی کھاؤ۔"

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ میں نے دونوں الائچیاں منہ میں ڈال لیں اور چبانے لگا۔ زاہدہ کہنے لگی:

"بس اب ہم نے مل لیا ہے۔ اب تم جاؤ۔"

مجھے اس پر غصہ آنے لگا:

"کیوں جاؤں؟ جاؤ نہیں جاتا۔"

زاہدہ کی آنکھیں سرد رات کے ستاروں کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ زاہدہ نے جلدی سے اپنا آپ چھڑا لیا اور تخت پوش پر سے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں بولی:

"خدا کے لئے اب چلے جاؤ۔ کوئی آگیا تو مصیبت آجائے گی۔"

میں بھی ڈر گیا کہ واقعی اگر نیچے سے اس کا کوئی بھائی وغیرہ اوپر آگیا تو مہابھارت کی جنگ چھڑ جائے گی۔ وہ تو مجھے اٹھا کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیں گے۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا:

"سیڑھیاں خالی ہیں ناں؟"

"ہاں ہاں بابا۔۔۔ بالکل خالی ہیں۔ اب جاؤ بھی۔"

میں نے چھت کے دروازے کو ذرا سا کھولا اور اندھیرے میں آکر دیوار کو پکڑ پکڑ کر بے آواز قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ دوسری منزل کے بند دروازے کے قریب سے گذرتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن اپنے آپ تیز ہوگئی۔ مگر میں خیر خیریت سے سیڑھیاں اتر گیا۔ پھر ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل گیا اور سرد ویران گلی دوڑ کر پار کی اور اپنے مکان کی بیٹھک میں آکر بستر پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں مجھے تپائی پر رکھے چھوٹے ٹائم پیس کی ٹک ٹک ہی سنائی دے رہی تھی۔ ابھی رات کے اندھیرے میں چمکنے والی سوئیوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ میں جوتے اتار کر اسی طرح لحاف میں گھس گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں موت کے منہ سے زندہ سلامت نکل کر آگیا تھا۔

میں زاہدہ سے اپنے عشق و محبت کے قصے زیادہ نہیں سناؤں گا۔ لیکن جو واقعات میں آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں' ان کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ان واقعات کا جاننا بہت ضروری ہے۔ گویا یہ ایک طرح کی بنیاد ہے جس پر میں اپنے رنگون کے سفرنامے کی عمارت تعمیر کر رہا ہوں۔ قصہ مختصر میں زاہدہ کی محبت کا اس بری طرح سے اسیر ہو گیا کہ سوائے زاہدہ کی محبت کے مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ نوجوانی کا عشق اور پھر میرے ایسے جذباتی انسان کا عشق ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس عشق میں اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ منہ زور وحشی عشق انسان کی عقل پر سوار ہو جاتا ہے اور جدھر اسکا جی چاہتا ہے' آدمی کو چلاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

میں سکول سے نکل کر کالج میں داخل ہو گیا۔ زاہدہ نے دسویں پاس کی تو وہ بھی کالج میں داخل ہو گئی۔ ہمارے محبت بھرے خطوں کا تبادلہ جاری تھا مگر ملاقاتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کیونکہ زاہدہ گھر سے باہر مجھے کہیں بھی ملنے پر تیار نہ ہوتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اچانک زاہدہ کی شادی ایک جگہ طے پا گئی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے زاہدہ کو خط لکھا کہ چلو ہم لاہور سے کراچی بھاگ جاتے ہیں۔ وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔ زاہدہ نے میرے خط کے پیچھے یہ لکھ کر خط مجھے واپس کر دیا کہ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ میں ماں باپ کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے بھی صبر کر لیا ہے۔ تم بھی صبر کر لو۔ اس دنیا میں نہ سہی' انشاء اللہ اگلی دنیا میں ہم ضرور ملیں گے۔ مگر میں تو اس چلتی پھرتی نظر آتی دنیا میں ہی زاہدہ کو ملنا چاہتا تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں کیسے صبر کر لیتا۔ صبر کرنے کے

سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن میرے اندر تھوڑی دیر بعد ایک الاؤ سا روشن ہو جاتا۔ ایک شعلہ سا اٹھتا اور میں دیوانوں کی طرح گھر سے نکل کر باہر آجاتا اور ریلوے لائن کے پرانے قبرستان میں اور کبھی کسی باغ میں خود فراموشی کے عالم میں پھرتا رہتا۔

زاہدہ کو کالج سے اٹھالیا گیا تھا۔ دو دن کے اندر اندر زاہدہ کی شادی ہوگئی۔ جس روز زاہدہ کی برات آئی تھی، میں اپنے گھر میں نہیں تھا۔ بلکہ اپنے ایک دوست کے مکان پر فیض باغ میں سر جھکائے بیٹھا تھا اور میرا دوست مجھے حوصلہ اور تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ساری رات اپنے دوست کے مکان پر گذار دی۔ میرے گھر والوں کو زاہدہ سے میری محبت کا کچھ کچھ علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ میرے دوست نے میرے گھر خبر کر دی تھی کہ میں اس کے مکان پر ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

دوسرے دن میں اپنے دوست کے ساتھ گلی میں آیا تو وہاں رات کو پکائی گئی برات کی دیگوں کی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ گیندے کے مسلے ہوئے پھول بھی گلی میں پڑے تھے۔ اس زمانے میں شادیوں پر دلہا گیندے کے پھولوں کا سہرا باندھا کرتے تھے۔ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے اور میں اپنے مکان کی بیٹھک میں چارپائی پر گر کر دیر تک سسکیاں بھر بھر کر روتا رہا۔ زاہدہ کی بے وفائی نے میرے دل پر ایک گھاؤ سا ڈال دیا تھا۔ میرا دوست مجھے سمجھا رہا تھا کہ تم مرد ہو۔ مرد بنو۔ ایک زاہدہ کیا ہے تمہیں کئی زاہدائیں مل جائیں گی۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ مگر میں روتے ہوئے یہی کہتا:۔

"زاہدہ ایسی لڑکی مجھے کہیں نہیں مل سکتی' زاہدہ میری روح ہے۔ زاہدہ میری زندگی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گا۔"

کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ مگر زاہدہ کی محبت کا زخم وقت کے ساتھ ساتھ کھلتا اور مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ زاہدہ کی شادی کو تین مہینے گذر گئے تھے مگر میں پہلے روز کی طرح اس کی جدائی میں بے چین اور بے قرار تھا۔ زاہدہ کو اسکا خاوند بیاہ کر اپنے ساتھ رنگون لے گیا تھا۔ اس کا رنگون میں اپنا کاروبار تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ زاہدہ کے خاوند کی عمر زیادہ ہے مگر چونکہ اس کے ماں باپ مر چکے تھے اور بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا اور رنگون میں اسکا لاکھوں کا بزنس تھا' اس لئے زاہدہ کے بھائیوں نے فوراً وہاں شادی کر دی تھی۔ زاہدہ کے خاوند کا نام مشتاق احمد تھا۔ وہ زاہدہ کے بڑے بھائی کا پرانا ملنے والا تھا۔ ان لوگوں نے رنگون سے مشتاق احمد کے کاروبار کے بارے میں پوری معلومات حاصل کی تھیں اور پوری تسلی کرنے کے بعد زاہدہ کی بات وہاں پکی کی تھی۔ مگر بڑے بھائی نے یہ نہ سوچا کہ خاوند کی عمر زاہدہ سے کم از کم پندرہ بیس برس زیادہ ہے۔ بس اسے دولت مند اور اکیلا دیکھ کر شادی کر دی اور زاہدہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی عزت پلے باندھ کر ادھیڑ عمر خاوند کے ساتھ رنگون روانہ ہو گئی۔

زاہدہ کے رنگون چلے جانے کے بعد میرا وہی حال ہو گیا جو پنجرے میں قید پرندے کا ہوتا ہے۔ اگر وہ شادی کے بعد لاہور، کراچی یا کسی دوسرے شہر میں رہتی تو یہ امید تھی کہ میں اسے کبھی نہ کبھی دیکھ سکتا تھا۔ اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ مگر اب تو وہ سمندر پار چلی گئی تھی۔ اس سے بات کرنا تو بڑی دور کی بات تھی، میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سارا لاہور شہر مجھے قید خانہ لگنے لگا۔ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا کہ کسی طرح اڑ کر زاہدہ کے پاس رنگون پہنچ جاؤں۔ اگرچہ میں اس عمر میں ہی کلکتہ، بمبئی کے دو چار چکر لگا چکا تھا اور پردیس میں رہ کر سختیاں جھیلنے کا عادی ہو چکا تھا لیکن رنگون، لاہور سے بہت دور تھا اور سمندر کو میں نے دیکھا ضرور تھا مگر اس میں کبھی سفر نہیں کیا تھا۔

مگر عشق سچا ہو تو پھر وہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ زاہدہ کا عشق میرے سر پر جنون بن کر سوار ہو چکا تھا۔ آخر میں نے زاہدہ کے پیچھے رنگون جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے تو میں نے خاص ترکیب لڑا کر رنگون میں زاہدہ، اپنے خاوند مشتاق احمد کے ساتھ جہاں رہتی تھی، اس کا پورا ایڈریس حاصل کر لیا۔ اس کے بعد جو اہم مسئلہ تھا، وہ پیسوں کا تھا۔ پہلے مجھے کلکتے جانا تھا۔ وہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر رنگون جانا تھا۔ میں نے اپنے فیض باغ والے دوست سے مل کر ساری معلومات حاصل کر لی

تھیں۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ یہی حال میرے فیض باغ والے دوست کا تھا۔ کافی سوچا کہ سفر کے اخراجات کے لئے رقم کہاں سے حاصل کی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا ذکر میں نے اپنے فیض باغ والے دوست سے بالکل نہ کیا۔ چوری لے دے کے میں اپنے گھر میں ہی کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ والد صاحب جب بھی کوئی رقم لا کر والدہ کے حوالے کرتے تو وہ اس رقم کو پوٹلی میں باندھ کر ایک ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا کرتی تھیں۔ میرا ٹارگٹ وہ پوٹلی تھی۔ گھر میں چوری کرنے کے لئے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ جس روز مجھے لاہور سے روانہ ہونا تھا' اس سے ایک رات پہلے میں نے صندوق میں سے پوٹلی نکالی۔ اس میں چار نوٹ سو سو کے تھے اور باقی چاندی کے کتنے ہی روپے تھے۔ میں نے سو سو کے چاروں نوٹ اور پندرہ بیس چاندی کے روپے اڑا لئے۔ ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔ یہی دھڑ کا لگا رہا کہ اگر میری موجودگی میں چوری کا پتہ چل گیا تو میں اپنے ضمیر کی لعنت ملامت برداشت نہ کر سکوں گا۔ لیکن خیریت رہی۔ رات کو کسی نے صندوق نہ کھولا۔

اس زمانے میں لاہور سے ہوڑہ ایکسپریس یا ہوڑہ میل سبز رنگ کی گاڑی چلا کرتی تھی جو' جہاں تک مجھے یاد ہے پیچھے پشاور یا راولپنڈی سے تیار ہو کر آتی تھی اور کلکتے جاتی تھی۔ اس ٹرین میں' میں دو تین بار کلکتے کا سفر کر چکا تھا۔ ایک بار اپنے ماموں کے ساتھ' دوسری بار اکیلا اور تیسری بار بھی شاید میں گھر سے بھاگ کر ہی گیا تھا۔ کلکتے کی زکریا سٹریٹ کے علاقے میں ہمارے رشتے دار کشمیریوں کا گرم شالوں کی رفوگری' دھلائی اور فروخت کا

چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کلکتے سے رنگون تک بحری جہاز کا تھرڈ کلاس یعنی عرشے پر سفر کرنے کا کرایہ بائیس یا تیئس روپے یا اس سے دو چار روپے زیادہ تھا۔ اب مجھے ٹھیک سے کرائے کی اصل رقم یاد نہیں رہی۔ رنگون جانے کے لئے اس وقت پاسپورٹ ' ویزے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ ہندوستان پر بھی انگریزوں کی حکمرانی تھی اور برما بھی انگریزوں کی سلطنت میں شامل تھا۔

خیر کسی نہ کسی طرح سوتے جاگتے رات کٹ گئی۔ میں نے ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تیار کر کے اپنے دوست کے گھر فیض باغ میں پہلے ہی رکھوا دیا تھا۔ ہوڑا ایکسپریس لاہور سے صبح شاید نو' سوا نو بجے یا آٹھ چالیس پر روانہ ہوا کرتی تھی۔ میں سات بجے ہی اپنے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ موسم کی صورت حال یہ تھی کہ بہار گذر چکی تھی اور گرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ چھت پر سونے لگے تھے۔ میں نے قمیض پتلون پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں جرابوں کے ساتھ چمڑے کا بوٹ پہن رکھا تھا۔ نوٹ میں نے زرد رنگ کے حاجیوں والے رومال میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ رکھے تھے۔ چاندی کے روپے بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ صرف سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں ڈال کر جیب کا بٹن بند کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جیبوں کو زپ کے ساتھ بند کرنے کا فیشن نہیں تھا۔

ہم تانگے میں بیٹھ کر فیض باغ سے لاہور سٹیشن پر آ گئے۔ میرے دوست کا نام سلیمان تھا۔ یہ میں نے اپنے دوست کا اصلی نام لکھا ہے۔ سلیمان نے پیسے نکال کر تانگے والے کو دیئے اور میرا چھوٹے سائز کا اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ ہم نے ایک قلی سے ہوڑہ ایکسپریس کے بارے میں پوچھا۔ قلی

نے بتایا کہ ہوڑا ایکسپریس ابھی لاہور نہیں پہنچی۔ میں نے لاہور سے کلکتے تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ میرے دوست سلیمان نے ایک آنے یا شاید دو آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ لے لیا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر آگئے جہاں ہوڑہ ایکسپریس آنے والی تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں ہندو، سکھ مرد اور ہندو، سکھ عورتیں بھی تھیں۔ گاڑی آئی۔ مجھے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کھڑکی کے پاس سیٹ مل گئی۔ سامان تو میرے پاس صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ہی تھا۔ اسے میں نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ سلیمان پلیٹ فارم پر ڈبے کی کھڑکی کے پاس کھڑا مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اب وہ مجھے رنگون جانے سے روک تو نہیں سکتا تھا۔ بس یہی بار بار تاکید کر رہا تھا کہ رقم کا خیال رکھنا۔ کمر کے ساتھ جو رقم باندھ رکھی ہے، اسے سب کے سامنے مت کھولنا۔ جاتے ہی خط ضرور لکھنا۔ انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے بھی سیٹی دی۔ دو تین سیٹیوں کے بعد گاڑی چل پڑی۔ سلیمان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا:

"جاتے ہی خط لکھنا۔ خدا حافظ۔"

میں بھی جذباتی ہو گیا مگر میں نے بہت جلد اپنے اوپر قابو پالیا۔ گاڑی پلیٹ فارم سے نکل کر لاہور اسٹیشن کے یارڈ میں سے بل کھاتی گذرنے لگی۔ شہر کے مضافات سے باہر نکلتے ہی گاڑی نے سپیڈ پکڑی۔۔ ہوڑہ ایکسپریس بڑی تیز رفتار گاڑی تھی اور بڑے بڑے اسٹیشنوں پر ہی رکتی تھی۔ لاہور سے چلی تو مغل پورہ چند سیکنڈوں کے لئے رکی۔ مغل پورے سے چلی تو طوفان میل کی طرح دوڑنے لگی۔ امرتسر شہر کا سٹیشن آگیا۔ یہاں سے نکلی تو سیدھا جالندھر جا کر دم لیا۔

کلکتے تک کا سفر بھی کافی لمبا سفر تھا۔ ہوڑہ ایکسپریس پورا دن پوری رات چلتی رہی۔ دوسرے دن کہیں شام کے قریب جاکر کلکتہ پہنچی۔ میرے لئے یہ شہر اجنبی نہیں تھا۔ میرے والد صاحب کا ایک دوست حاجی اقبال لوئر چیت پور روڈ پر بوٹوں کی دکان کرتا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔ زکریا سٹریٹ والے اپنے رشتے داروں کے ہاں جانا خطرناک تھا۔ حاجی اقبال اس وقت دکان پر کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے کسی گاہک سے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے سامنے نہ آیا۔ جب گاہک چلا گیا تو میں نے جاکر سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران سے ہوئے۔ پوچھا:

"کیوں میاں۔۔۔ کب آئے ہو؟"

میں نے کہا:

"ابھی ہوڑے ایکسپریس سے اترا ہوں۔"

"خیریت تو ہے ناں؟"

میں نے کہا:

"جی ہاں۔۔ سب خیریت ہے۔"

"سامان کہاں ہے؟"

میں نے اٹیچی کیس کاؤنٹر کے ساتھ ہی رکھتے ہوئے کہا:

"بس یہی سامان ہے انکل۔"

حاجی اقبال نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا اور میرے لئے چائے اور بند مکھن منگوایا۔ پھر پوچھا کہ میں گھر سے بھاگ کر تو نہیں آیا؟ میں نے دل میں سوچا کہ حاجی صاحب کو زاہدہ کا نام لئے بغیر سب کچھ سچ بتا دینا

چاہئے۔ کیونکہ اب وہ مجھے واپس لاہور تو بھیج نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے ان کی وساطت سے مجھے رنگون میں کہیں سر چھپانے کو جگہ مل جائے۔ میں نے کہا:

"انکل! میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گا' بات دراصل یہ ہے کہ میں گھر میں کسی کو بتائے بغیر نکل آیا ہوں۔ میرا ارادہ اس بار رنگون شہر کی سیر کرنے کا ہے۔"

حاجی صاحب مزید حیران ہو گئے۔ پھر ہنس کر بولے:

"میاں برخوردار! یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم اکثر گھر سے بمبئی' کلکتے بھاگ جایا کرتے ہو۔ مگر رنگون تو ایک دوسرا ملک ہے۔ یہاں کلکتے میں تو پھر بھی تمہارے والد کے کچھ جاننے والے موجود ہیں مگر رنگون میں کس کے پاس جاؤ گے؟"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً کہا:

"انکل! میں تو اس امید پر رنگون جا رہا ہوں کہ وہاں آپ کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہو گا۔ مجھے وہاں زیادہ دیر تو ٹھہرنا نہیں' بس ایک ڈیڑھ مہینہ رنگون کی سیر کروں گا اور واپس آ جاؤں گا۔"

حاجی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے:

"بہتر ہوتا کہ تم اپنے والد کو بتا کر آتے۔"

میں نے کہا:

"انکل! ابا جان نے مجھے کبھی اجازت نہیں دینی تھی۔ اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ مجھے نئے نئے شہر دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

حاجی صاحب نے سرزنش کرنے کے لہجے میں کہا:

"میاں نئے نئے شہر دیکھنے کا شوق کس کو نہیں ہوتا۔ مگر پہلے اپنی پڑھائی تو مکمل کر لو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ پیچھے گھر میں تمہارے والد اور والدہ کتنی پریشان ہوں گی۔"

میں نے کہا:

"میرے دوست نے انہیں بتادیا ہو گا کہ میں رنگون جارہا ہوں۔"

حاجی صاحب منہ میں بڑبڑانے لگے۔ جیسے مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں۔ میں خاموشی سے چائے کے ساتھ بند کھاتا رہا۔ مجھے نہ تو گھر والوں کی پریشانی کی فکر تھی' نہ حاجی صاحب کے مجھے برا بھلا کہنے کی پرواہ تھی۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حاجی صاحب کے ذریعے رنگون میں مجھے رات کو سونے کی جگہ مل جائے۔ وہ بھی ہفتے' دو ہفتے کے لئے۔ اس کے بعد میں کہیں نہ کہیں اپنا بندوبست کر ہی لوں گا۔ مجھے ایسی باتوں کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ رات میں حاجی صاحب کی دکان کے پچھلے چھوٹے سے کمرے میں ہی سویا۔ کمرے کے آگے چھوٹا سا صحن تھا۔ چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جہاں بلڈنگ کی عقبی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ وہیں کونے میں ایک بڑا گندا باتھ روم بھی تھا۔ صبح دس بجے تک میں سویا رہا۔

جب منہ ہاتھ دھو کر دکان میں آیا تو حاجی صاحب دکان پر آچکے تھے۔ انہوں نے میرے لئے ناشتہ منگوایا۔ کہنے لگے:

"میاں! تم میرے بڑے عزیز دوست کے بیٹے ہو۔ تم بالغ ہو۔ اپنا برا بھلا خود سمجھ سکتے ہو۔ اول تو تمہیں گھر سے بغیر اطلاع اتنے لمبے سفر پر نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ اب تم نکل ہی آئے ہو تو میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ میں تمہارے والد کو تمہاری خیریت کا خط لکھ دوں گا۔ باقی رہا

رنگون میں کہیں سر چھپانے کا معاملہ' تو ایسا ہے کہ رنگون میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ اس کی مغل سٹریٹ میں فرنیچر کی دکان ہے۔ اس کا نام بھی اقبال ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ خط اسے جاکر دکھا دینا۔ وہ تمہارے ٹھہرنے کا کہیں نہ کہیں بندوبست کر دے گا۔ مگر ایک بات ہے۔"

میں نے پوچھا:

"جی انکل؟"

حاجی صاحب بولے:

"میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں پندرہ بیس دن سے زیادہ ٹھہرو۔ میں اپنے دوست کا اس سے زیادہ احسان نہیں لینا چاہتا۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ تم پندرہ بیس دن میں رنگون کی سیر کر کے واپس چل پڑو۔ اگر وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کا تمہارا پروگرام بن جائے تو برخوردار میں صاف بات کروں گا۔ پھر تمہیں وہاں اپنے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام خود کرنا ہو گا۔"

میں نے حاجی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے دوست کے ہاں دس پندرہ دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا۔"

حاجی صاحب نے کاؤنٹر کے دراز میں سے پان مارکہ بیڑی کا بنڈل نکالا۔ اس میں سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور کش لگا کر بولے:

"تمہارے پاس رنگون کا کرایہ ہے یا نہیں؟ اگر ضرورت ہو تو مجھ سے پیسے لے لو۔"

میرے پاس کافی پیسے تھے۔ میں نے کہا:

"نہیں انکل' آپ زحمت نہ کریں۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔"

حاجی صاحب نے جھٹ سے پوچھا:۔

"یہ کہاں سے آئے ہیں پیسے؟ تم کوئی کام تو کرتے نہیں تھے۔"

میں نے ہنس کر کہا:

"انکل نے ایک اخبار میں تین مہینے نوکری کرلی تھی۔ تنخواہ بچاکر رکھ لیا کرتا تھا۔"

"کمال ہیں آج کل کے لڑکے بھی۔"

حاجی صاحب نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا اور بازار میں سے گذرتی' شور مچاتی ٹرام کو دیکھنے لگے۔ پھر ایک گاہک آگیا۔ حاجی صاحب نے اپنے نوکر کو آواز دے کر کہا:

"وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو' گاہکوں کا بھی خیال رکھا کرو۔"

میں جتنی جلدی ہو سکے' کلکتہ سے رنگون روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کلکتہ سے سمندری جہاز کس دن اور کس وقت روانہ ہوتا ہے۔ میں نے اس بارے میں حاجی صاحب سے سوال کیا تو انہوں نے کہا:

"میاں! جنگ لگی ہوئی ہے۔ جہازوں پر فوج اور فوجی سامان رنگون بھیجا جا رہا ہے۔ ہفتے میں ایک بار مسافروں والا جہاز جاتا ہے۔"

میں نے حاجی صاحب سے کہا:

"انکل! جنگ تو جرمنی اور ولایت میں لڑی جا رہی ہے۔"

حاجی صاحب نے بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا:

"بھائی مجھے کچھ معلوم نہیں کہ انگریز بادشاہ انڈین فوجوں کو کہاں بھیج رہا ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ انگریزوں کی حکومت نے بہت سے

جہازوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ اور ان پر سامان اور فوج کی پلٹنوں کو کہیں بھیجا جاتا ہے۔ تم فکر نہ کرو' میں آج ہی معلوم کر لوں گا کہ مسافروں کا جہاز کس دن رنگون جاتا ہے۔"

مجھے یہ بھی دھڑ کا لگا ہوا تھا کہ کہیں حاجی صاحب نے پیچھے لاہور تار نہ بھیج دیا ہو کہ میں ان کے پاس ہوں اور وہاں سے میرا بڑا بھائی آ کر مجھے دبوچ لے۔ پھر تو میں زاہدہ سے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن جب شام کو حاجی صاحب نے بتایا کہ ایک سمندری جہاز کل دوپہر بارہ بجے رنگون جانے والا ہے تو میرے سارے خدشات ختم ہو گئے۔ حاجی صاحب کو میں نے چالیس روپے دیئے تو وہ بولے:

"اس میں سے کچھ پیسے بچ جائیں گے۔ رنگون تک کا سمندری جہاز کا کرایہ چالیس روپوں کے اندر اندر ہے۔"

رات کو میرا بحری جہاز کا ٹکٹ آ گیا۔ میں بڑا خوش ہوا۔ اب زاہدہ کے پاس جانے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میرے راستے میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ وہ رات میں نے زاہدہ کے خیال میں اس کی حسین یادوں کے درمیان سوتے جاگتے گذار دی۔ اگلے روز حاجی صاحب نے مجھے دس روپے میں ناشتہ کروایا اور ایک نوکر میرے ساتھ کرتے ہوئے اسے تاکید کی:

"او ہری داس! یہ میرا بھتیجا ہے مگر مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ اسے رنگون جانے والے جہاز پر چڑھانا ہے۔ اور سنو! جب تک جہاز تمہاری آنکھوں کے سامنے رہے' تم بھی جیٹی پر کھڑے رہنا۔ جب جہاز آنکھوں سے اوجھل ہو جائے' تب واپس آنا۔ کیا سمجھے؟"

ہری داس حاجی صاحب کا بنگالی ملازم تھا۔ لڑکا ساتھا۔ ہنس کر بولا :

"ہم ادھر ہی ٹھہرے گا۔"

حاجی صاحب نے مجھے رنگون میں اپنے دوست اور اپنے ہم نام اقبال صاحب کے نام خط دیا جو میں نے سنبھال کر پتلون کی پچھلی جیب میں رکھ لیا۔ حاجی صاحب بولے :

"اقبال کو میرا زبانی بھی سلام کہنا۔ لفافے پر میں نے اس کی دکان کا نام پتہ لکھ دیا ہے۔ اقبال فرنیچر مارٹ دکان کا نام ہے۔ میں صرف ایک بار ہی رنگون گیا ہوں۔ تمہیں جٹی پر سے رکشا ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔ اسے کہنا مغل سٹریٹ جامع مسجد ٹیپو سلطان چلے۔ اقبال کی دکان مسجد کے پاس ہی ہے"

حاجی صاحب نے مجھے گلے لگا کر خدا حافظ کہا اور میں ان کے نوکر ہری داس کے ساتھ ٹرام میں بیٹھ کر خضر پور جٹی کی طرف چل دیا۔ کلکتے کی بندرگاہ کا نام خضر پور جٹی ہے' جو شہر کے شمال مغرب میں کافی دور واقع ہے۔ ہم نے دو جگہوں سے ٹرامیں بدلیں۔ پھر ایک رکشے میں بیٹھے جس نے ہمیں بندرگاہ پر پہنچادیا۔ دور ہی سے مجھے جہازوں کے اونچے اونچے مستول نظر آئے جن کے ساتھ رنگ برنگے جھنڈے کلکتے کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس زمانے میں خضر پور جٹی کی عمارت ابھی پرانی ہی تھی۔ اب تو اس کی جگہ ایک جدید عمارت بن گئی ہے۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ میں نے نوکر سے کہا :

"اب تم بے شک واپس چلے جاؤ۔ میں خود ہی جہاز پر سوار ہو جاؤں گا۔"

بنگالی نوکر سرہلانے لگا :

"نائیں صاحب ۔۔۔ حاجی صاحب غصے ہو گا، ہم ادھر ہی ٹھہرے گا۔"

سامنے سڑک پار کر کے ہم ایک بہت بڑے ہال کے پھاٹک پر پہنچے۔ یہاں کچھ موٹریں، رکشے اور دو چار فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ مسافر اپنے بال بچوں کو لئے سامان قلیوں کے سروں پر رکھوائے ٹکٹ دکھا کر پھاٹک میں سے گذر رہے تھے۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ زمانہ زیادہ رش کا نہیں تھا۔ ریل گاڑیوں میں بھی آج کی طرح رش نہیں ہوتا تھا۔ کوئی کوئی گاڑی ایسی ہوتی تھی کہ جس میں مسافروں کا بہت رش ہوتا تھا اور کچھ مسافر ڈبے کے پائیدانوں پر بھی کھڑے ہوتے تھے۔

میں نے اپنا چھوٹا اٹیچی کیس ایک ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ پھاٹک کے پاس سٹول پر ایک نیلی وردی والا آدمی بیٹھا ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ میری باری آئی تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر ٹکٹ آدھا پھاڑ کر مجھے دے دیا۔ میں نے ٹکٹ بھی سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ بنگالی نوکر وہیں رک گیا۔ کہنے لگا:

"بابو! ہم پیچھے سے اوپر جائے گا اور تمہارے جہاز کو جاتے دیکھے گا۔"

میں نے اسے پنجابی میں کہا:

"توں ہن جتھے مرضی جا۔"

بنگالی نوکر ہنسا اور ہاتھ ہلا کر دوسری طرف چلا گیا۔ اب میں ایک بہت بڑے ہال کمرے میں تھا جس کی آہنی چھت کے گارڈر بہت اونچے تھے۔ لوہے کے چوکور ستونوں کے پاس جگہ جگہ مسافر اپنے اپنے کنبوں اور سامان کو لیے بیٹھے تھے۔ کھا پی رہے تھے۔ باتیں بھی کر رہے تھے۔ انڈیا کے تقریباً ہر

صوبے کی زبان بولی جا رہی تھی۔ بنگالی مسافر بھی تھے، گجراتی بھی تھے اور مدراسی مسافر بھی تھے۔ ایک سکھ فیملی بھی نظر آئی۔ سردار صاحب دری بچھائے سامان کے پاس بیٹھے ڈاڑھی میں کنگھی پھیر رہے تھے۔ ان کا سر پگڑی کے بغیر تھا اور جونڈا بسنتی رومال میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ سردار صاحب پنجابی ہیں، ان کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔

میں نے قریب جا کر ست سری اکال کہا تو سردار صاحب نے اپنی کرنجی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔۔۔

"کیوں بھئی۔ کیا بات ہے؟"

میں نے پنجابی میں پوچھا کہ رنگون جانے والا جہاز کب روانہ ہو گا۔ سردار صاحب نے بنیان دھوتی پہن رکھی تھی۔ کمر میں کرپان لگی تھی جس کا نیام نیلا تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب ہو گی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ پیٹ پھولا ہوا تھا۔ خوش ہو کر پنجابی میں جواب دیا:

"بادشاہو جب کہو گے، جہاز چلا دیں گے، آ جاؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ اوپر پنکھے کی ہوا آ رہی ہے۔ اکیلے ہو یا فیملی بھی ساتھ ہے۔"

سردار صاحب کی پنجابی کا لہجہ لاہوریوں، امرتسریوں والا تھا۔ میں ان کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔

"جی، میں اکیلا ہی ہوں۔"

"چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔ میں بھی اکیلا ہوں۔ ہمارا تمہارا ساتھ رہے گا۔ پہلے بھی کبھی رنگون گئے ہو؟"

میں نے کہا:

"جی نہیں سردار صاحب! میں پہلی بار جا رہا ہوں۔"

سردار صاحب ہنسے۔ ان کی لٹکی ہوئی توند بھی ہلنے لگی۔۔

"اوئے یارا! پھر تو تمہیں فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں تو رنگون کا مگر مچھ ہوں۔ چھوٹا سا تھا جب رنگون آیا تھا۔ میرا وہاں اپنا ہوٹل ہے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو۔؟"

میں نے لاہور کا نام لیا تو سردار صاحب کنگھی کرنے کے بعد ڈاڑھی کے بالوں کو مروڑیاں دیتے ہوئے بولے:

"آپاں امرتسر کے ہیں۔ اوئے کبھی امرتسر بھی گئے ہو؟ مائی سیواں کا بازار دیکھا ہے؟ مائی سیواں کے بازار میں ایک گلی ہے "گوراں دتہ گلی" وہاں میں پیدا ہوا تھا۔ پھر میرا پیو مجھے اپنے ساتھ رنگون لے گیا۔"

میں نے دوبارہ پوچھا کہ رنگون جانے والا جہاز کہیں لیٹ تو نہیں ہے۔ سردار صاحب نے ڈاڑھی کے بالوں کو اچھی طرح باندھا۔ پھر اپنے ٹرنک پر سے نیلے رنگ کی پگڑی اٹھا کر جھاڑی اور اسے سر پر بڑے خاص انداز میں باندھنے لگے۔۔

"اوئے پتر! توں فکر ہی نہ کر۔ ہم جہاز کو لیٹ ہونے دیتے ہیں بھلا۔"

پھر اوپر پنکھے کی طرف دیکھ کر بولے:

"پنکھے بھی ان کنجروں نے اتنی اوپر جا کر لگائے ہیں کہ ہوا ہی نہیں آتی۔"

جیٹی کے اتنے وسیع و عریض ہال کی اونچی چھت کے ساتھ نہ جانے کتنے پنکھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لٹک رہے تھے اور مسلسل چل رہے تھے۔ کلکتے میں لاہور کے مقابلے میں کافی گرمی تھی۔ مجھے بھی پسینہ آ رہا تھا۔

اتنے میں ایک طرف مسافروں کا شور بلند ہوا۔ سردار صاحب نے دونوں ہاتھوں سے پگڑی کو کانوں کے اوپر کبھی ادھر کبھی ادھر کرتے ہوئے اس طرف دیکھا جدھر مسافروں کا شور و غلغلہ بلند ہوا تھا۔ پھر ان سب مسافروں کو ایک زبردست گالی دی اور کہا:

"چل کاکا! جہاز جٹی پر آکر لگ گیا ہے۔"

سردار صاحب کا نیلی وردی والا کالا کلوٹا بنگالی قلی بھی آگیا۔ سردار صاحب نے کہا:

"چل اوئے منڈیا' چک ساڈا وی سمیان۔"

سردار صاحب کا سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک کافی بڑا بستر تھا جو ہولڈال میں بندھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں بستروں کو خاکی رنگ کے ہولڈال میں باندھ کر لے جانے کا عام رواج تھا۔ ہولڈال امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ غریب غرباء مسافر بستر کو دری یا کھیس میں لپیٹ کر اوپر رسی باندھ دیتے تھے۔ ایسے بستروں کو غریب مسافروں کا بستر سمجھا جاتا تھا اور ناپسند کیا جاتا تھا۔ قلی بھی ہولڈال والے بستر کے مسافر سے ادب سے بات کرتے تھے اور زیادہ پیسے چارج کرتے تھے۔

میں بھی سردار صاحب کے پیچھے اس طرف چل پڑا جدھر ان کا قلی سامان سر پر رکھے جا رہا تھا اور جدھر سارے مسافر ہم ہما کر جا رہے تھے۔ آگے ایک لوہے کا اونچا جنگلا لگا تھا جو صرف اتنا ہی کھلا تھا کہ اس میں سے ایک وقت میں ایک مسافر ہی گذر سکتا تھا۔ سامان دوسرے گیٹ سے چیک ہو کر اندر جاتا تھا۔ ہم بھی دوسرے مسافروں کے ہجوم میں گھس گئے۔ سردار صاحب کہنیاں چلاتے ہوئے مسافروں کو دھکیل بھی رہے تھے اور انہیں ٹھیٹھ

امرتسری پنجابی میں گالیاں بھی دے رہے تھے۔ کوئی مسافر گجراتی بول رہا تھا' کوئی تامل تلیگو بول رہا تھا تو کوئی مراد آباد کی اردو بول رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ان میں ایک بھی برمی مسافر نظر نہیں آ رہا تھا۔ برمی مردوں اور عورتوں کی تصویریں میں نے ان کے دھوتی شلوکے میں دیکھی ہوئی تھیں۔ ایسی کوئی عورت 'کوئی مرد وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ سیکنڈ کلاس کے گیٹ کی طرف سے اندر جا رہے ہوں۔ یہ تو تھرڈ کلاس کا گیٹ تھا۔

ہم بھی کسی نہ کسی طرح دھکے کھاتے' دھکے دیتے دروازے میں سے نکل کر جیٹی پر آ گئے۔ جیٹی پر آ کر دیکھا کہ ایک بحری جہاز پلیٹ فارم یا وارف کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس سے پہلے میں نے سمندری جہاز تصویروں میں ہی دیکھے تھے یا بمبئی کی بندرگاہ پر دور دور سے ہی دیکھے تھے۔ قریب سے سمندری جہاز کو دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ یہ بہت بڑا جہاز تھا۔

پہلی منزل کے عرشے کے جنگلے کی ریلنگ کا پالش چمک رہا تھا۔ یہاں کچھ انگریز اور کچھ دوسرے خوش پوش مرد' یورپین اور رنگین ساڑھیوں والی عورتیں کھڑی تھیں۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے کیبنوں کی گول کھڑکیوں پر شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ یہ غالباً پہلے اور دوسرے درجے کا عرشہ یا ڈیک تھا۔ اس سے اوپر تیسری منزل یعنی تھرڈ کلاس کا عرشہ تھا۔ اس کے جنگلے پر بھی کچھ مسافر جھکے ہوئے نیچے دیکھ رہے تھے اور اپنے اپنے رشتے داروں کو آوازیں دے رہے تھے۔ ایک جانب سیکنڈ اور فرسٹ کلاس والوں کے لئے بڑی چمکیلی تانبے کی ریلنگ والی سیڑھی لگی تھی۔ ایک طرف تھرڈ کلاس کے مسافروں کے لئے لکڑی کے چوڑے تختوں والی سیڑھی لگی تھی۔

سردار صاحب نے اس سیڑھی کی طرف اشارہ کیا اور بولے:

"ہماری پوڑی وہ ہے کاکا۔"

پھر مسافروں کے ہجوم میں سے اپنے قلی کو تلاش کرنے لگے۔ جب قلی کہیں دکھائی نہ دیا تو اسے موٹی سی گالی دی اور بولے:۔

"کتھے چلا گیا ہے۔"

اتنے میں قلی نظر آ گیا۔ میں اگر چاہتا تو اکیلا جہاز پر چڑھ جاتا۔ لیکن میں جان بوجھ کر سردار صاحب کے پاس ہی کھڑا رہا۔ مجھے ان سے یہ غرض تھی کہ یہ رنگون کے باشندے ہیں' وہاں میری کچھ نہ کچھ مدد کر سکیں گے۔ قلی کو دیکھ کر سردار نے ایک بار پھر اسے گالی دی اور گردن پر مکا مار کر کہا:

"کتھے رہ گیاں ساں اوئے سورا۔ چل اوپر۔"

جہاز کے تھرڈ کلاس ڈیک پر قدم رکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جہاز بے معلوم انداز میں ڈول رہا ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ جہاز پانی میں کھڑا تھا اور جہاز پر مسافروں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ سردار صاحب تجربہ کار مسافر تھے' قلی کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بستر کہاں لگانا ہے۔ جہاز کا سارا ڈیک بغیر چھت کے تھا۔ صرف درمیان میں جہاں دوسری یعنی نچلی منزل کی سیڑھی اترتی تھی اور لنگر ڈالنے والی مشین تھی۔ مشین کے پاس لوہے کی بہت بڑی چرخی کے ساتھ آہنی سنگل بندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لوہے کا بہت بڑا اور وزنی لنگر نیچے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں اوپر چھت پڑی تھی اور ذرا آگے کو نکلا ہوا ترپال کا سائبان بھی تھا۔ قلی نے سردار صاحب کا بستر وہاں لگا دیا تھا۔ سردار صاحب خوش خوش بنیان والی توند باہر کو نکالے بستر پر جا کر بیٹھ گئے اور دری پر ایک طرف ہاتھ مارتے ہوئے مجھے کہا:۔ "بہہ جا کاکا توں وی ایتھے۔"

تھوڑی دیر میں ان کے پاس بیٹھا۔ پھر اٹھ کر عرشے کی سیر کرنے لگا۔ عرشے پر لوگوں نے درمیان میں کیبن کی بیضوی دیوار کے ساتھ ساتھ اپنے صندوق اور دوسرا سامان لگا دیا تھا۔ اوپر کھیس اور چادریں وغیرہ تان دی تھیں۔ بیچ میں بھی کہیں کہیں چادریں تان کر مسافروں نے جن کے ساتھ عورتیں سفر کر رہی تھیں' پردہ سا بنا لیا تھا۔ ایک دبلا پتلا کالی ٹوپی اور تنگ پاجامے کرتے والا گجراتی گھبرایا ہوا ڈیک پر ادھر ادھر کسی کو آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔ ایک جگہ سامان کے پاس ایک اداس آنکھوں اور گہری سانولی رنگت والی نوجوان لڑکی اپنی ماں کے پاس گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی ماں کو تھیلے میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکالتے دیکھ رہی تھی۔ میں قریب سے گزرا تو اس نے اداس آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پھر نظریں جھکا لیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ مسکرائی نہیں تھی۔ اس عمر میں ہر نوجوان کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ کر جہاز کی دوسری طرف جہاں جنگلا لگا ہوا تھا' وہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے دور تک دریا کا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ دور کنارے پر درخت نظر آ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ دریا کا پانی گدلا اور مٹیالا تھا۔ یہ دریائے جمنا تھا جس کو بنگال یا کلکتے میں داخل ہونے کے بعد دریائے ہگلی کہا جاتا ہے۔ جب بھی میں کلکتے آتا' کشتی میں بیٹھ کر دریائے ہگلی کی سیر ضرور کرتا تھا۔ پہلے خضر پور بستی اور فرانسیسی نو آبادی کے اکلوتے شہر چندر پور میں دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ میں اپنے کلکتے کے ایک دوست کے ساتھ کشتی لے کر دریا کے دوسرے کنارے کی طرف نکل جاتا تھا اور ہم درختوں کے نیچے گرے ہوئے ناریل اٹھا کر دریا میں زور سے پھینکا کرتے تھے۔

چندر نگر انڈیا میں فرانس کی واحد نو آبادی تھی۔ انگریزوں نے پاکستان اور انڈیا کی آزادی کے وقت تک اس نو آبادی پر قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ اسے فرانسیسیوں کے پاس ہی رہنے دیا تھا۔ جس طرح انڈیا کی مغربی گھاٹ پر گوا کی نو آبادی بھی تقسیم کے وقت پر تگالیوں کے پاس ہی تھی۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو بھارت نے ان دونوں نو آبادیوں پر قبضہ کر لیا۔ گوا پورے صوبے جتنی پر تگالی نو آبادی تھی۔ وہاں پر تگیزی ہارڈ فوجیوں اور بھارتی فوجوں میں کچھ دن لڑائی بھی ہوئی مگر چندر نگر پر تو آدھے گھنٹے میں انڈیا نے قبضہ کر لیا تھا۔

میں نے چندر نگر کا فرانسیسی زیر قبضہ شہر دیکھا ہوا ہے۔ وہاں کی ٹریفک پولیس کی وردی بالکل فرانس کی ٹریفک پولیس کی طرح تھی۔ گول گول نیلے رنگ کی ٹوپیاں ہوتی تھیں جن کے باڈر پر زرد پٹی لگی ہوتی تھی۔ دکانوں کے آگے سائن بورڈ بھی فرانسیسی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ وائن کی دکانیں جگہ جگہ تھیں۔ چندر نگر شہر کی سرکاری زبان فرانسیسی تھی۔ ویسے وہاں بنگالی اور پر تگیزی زبانیں بھی بولی جاتی تھیں۔ ہم چندر نگر کے گھاٹ سے ایک کشتی لے کر ہگلی دریا پار کیا کرتے تھے۔

یہ وہی ہگلی دریا تھا جسے میں جہاز کے عرشے سے دیکھ رہا تھا۔ مگر بندر گاہ پر اس کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور یہاں کنارے کے پاس وہ کافی گہرا بھی کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اتنا بڑا بحری جہاز بالکل جیٹی کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ میں یہاں سے ہٹ کر ڈیک کی اس جانب آ گیا جدھر سے مسافر جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ اب کوئی لیٹ لطیف قسم کا مسافر ہی بھاگم بھاگ چڑھتا نظر آتا تھا۔ جیٹی پر بندر گاہ کے ملازم ادھر ادھر بڑی پھرتی سے چیزیں ہٹا رہے

تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے جہاز کی سیکنڈ کلاس کی چمکیلی سیڑھی ہٹادی گئی۔ اس کے بعد تھرڈ کلاس کی سیڑھی بھی نیچے کھینچ لی گئی۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ اب جہاز چلنے والا تھا۔ ساتھ ہی مجھے ڈیک کے فرش پر تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی اور جہاز کے انجن چلنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینی شروع ہوگئی۔ جہاز کے انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ جہاز نے وسل دینے شروع کر دیئے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جہاز تین مرتبہ وسل دیتا۔ تھرڈ کلاس اور نیچے سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے مسافر بھی اپنے اپنے عرشے کے جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے اور جہاز کے جہٹی چھوڑنے کے منظر کا نظارہ کرنے لگے۔ لنگر کھینچنے والی مشین گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ چلنے لگی۔ جہاز کا آہنی لنگر اٹھایا جارہا تھا۔

جہٹی کے پلیٹ فارم یا وارف پر دونوں جانب جہاز کے موٹے رسے بھی ڈیک کے اوپر سے نیچے اچھال دیئے گئے۔ گویا جہاز قید و بند سے آزاد ہوکر سمندری سفر کے لئے بالکل تیار تھا۔ پھر اچانک مجھے ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ جہاز کے پیندے اور پلیٹ فارم کے کنکریٹ کے چبوترے کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ یہ فاصلہ آہستہ آہستہ زیادہ ہونے لگا۔ جہاز بندرگاہ سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میرے لئے یہ بڑا پرکشش منظر تھا۔ جہاز بندرگاہ کے پلیٹ فارم سے بالکل پہلو کی طرف سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ پھر اس نے آگے سے دائیں جانب دریا کے پاٹ کی طرف آہستہ آہستہ مڑنا شروع کر دیا۔ جب وہ ایک خاص زاویے تک مطلوبہ فاصلے تک گھوم چکا تو اس نے بالکل سیدھا چلنا شروع کر دیا۔ میں دوڑ کر عرشے کی دوسری جانب آگیا۔ دریا کی سطح پر تیرتی کشتیاں جہاز سے کافی فاصلے پر چلی گئی

تھیں۔ آبی پرندے جہاز کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ لوگ ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے دریا کی طرف اچھالتے' جنہیں پرندے غوطے لگا کر آتے اور جھپٹ کر لے جاتے۔ جہاز کے خلاصی یا ملاح بڑی تیزی سے اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ تھرڈ کلاس ڈیک کے آدھے سے زیادہ مسافر عرشے کے جنگلے سے لگ کر کلکتے کی خضر پور جیٹی کو آہستہ آہستہ دور ہوتے دیکھ رہے تھے۔ دور جیٹی پر ابھی تک مسافروں کے عزیز اور رشتہ دار کھڑے رومال ہلاتے نظر آ رہے تھے۔

پھر بندر گاہ اور جہاز کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ بندر گاہ کی جہازی عمارت چھوٹی ہوتے ہوئے بہت چھوٹی ہو گئی۔ دوسری جانب دریا کے دوسرے کنارے کے درخت بھی دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مگر اس جانب دریا کا کنارا ابھی تک جہاز کے ساتھ ساتھ متوازی چل رہا تھا۔ یا جہاز کے کنارے سے ہٹ کر ایک خاص فاصلے پر کنارے کے متوازی چل رہا تھا۔ ڈیک پر دریا کی ٹھنڈی اور مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ میرے بال بار بار ماتھے پر آتے جنہیں میں ہاتھ سے پیچھے کر دیتا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے میں کسی فلم کا ہیرو ہوں جو اپنی محبوبہ سے ملنے کسی گمنام جزیرے کی طرف جا رہا ہو۔ ہیروئن کے خیال کے ساتھ ہی مجھے زاہدہ یاد آ گئی۔ جب وہ دلہن بنی ہو گی تو کتنی حسین لگ رہی ہو گی۔ اس کے ہونٹوں کے آلوچے اور زیادہ سرخ ہو گئے ہوں گے۔ کاش وہ دلہن بن کر میرے گھر آتی۔ کاش اس کی شادی میرے ساتھ ہو جاتی۔ میرا دل جہاز کے ڈیک پر کھڑے یکدم اداس ہو گیا۔ نو عمری کی محبت میں کس قدر طاقت اور توانائی ہوتی ہے۔ آدمی اداس ہو کر بھی مایوس نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ کہ آدمی کا' جذبہ محبت کے جنسی پہلو کی

طرف بالکل دھیان نہیں جاتا۔ دوسروں کا تو مجھے پتہ نہیں، میں اپنی بات بتاتا ہوں کہ زاہدہ کی محبت میں اس کے جنسی پہلو کی طرف میرا کبھی دھیان ہی نہیں گیا بلکہ اس کے بعد بھی میں نے جتنی محبتیں کیں، ان میں یہ پہلو کہیں نہیں تھا۔ میری یہ محبتیں ایسی ہی تھیں جیسے کیچڑ میں سے کنول کا بے داغ پاکیزہ سفید پھول گردن اوپر اٹھائے مسکرا رہا ہو۔ یہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔

دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا۔ دھوپ کا رنگ سنہری ہونے لگا تھا۔ میں عرشے پر ہی جنگلے کے ساتھ لگ کر دریا کا نظارہ کرتا رہا۔ سردار صاحب کے پاس اس لئے نہ گیا کہ یہ وقت ان کی باتیں سن کر بور ہونے کا نہیں تھا بلکہ ایک شہر کو دور ہوتے اور دریا کے پاٹ کو آہستہ آہستہ فراخ ہوتے دیکھنے کا تھا۔ کیونکہ اس دریا کو آگے سمندر سے جا ملنا تھا۔ یہ خلیج بنگال کا سمندر تھا، جس کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ اس کی وجہ اس سمندر کی گہرائی نہیں تھی بلکہ سمندر کی تہہ میں اگی ہوئی اور چٹانوں کے ساتھ جمی ہوئی سیاہ کائی تھی جس کا لامتناہی سلسلہ خلیج بنگال کے سمندر کی گہرائیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں ایک جہاز ران نے بتائی تھی۔ دریا کے گھنے درختوں والا ایک جانب کا کنارا ایک خاص فاصلے پر ابھی تک جہاز کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا یا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دوسری طرف دریا کا جو کنارا تھا، اس طرف دور دور تک کلکتے کے مضافات کے کارخانوں کی چمنیاں، اونچی اونچی عمارتوں کی چوٹیاں اور کہیں کہیں دریا میں ابھرے ہوئے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ اب میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔

میں جنگلے سے ہٹ کر سردار صاحب کے پاس آ گیا۔ وہ ''گوربانی'' پڑھ رہے تھے۔ میں لنگر والی مشین سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے ایک

پل کے لئے بھی آنکھ اٹھا کر مجھے نہ دیکھا۔ میں اس موقع کو غنیمت جان کر اٹھا اور جہاز کے سامنے کی جانب جہاں جہاز کے دونوں حصے یا دیواریں یا سٹرابورڈ آکر ملتے تھے اور ایک تکون بن گئی تھی' وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ نیچے دیکھا تو جہاز کی پتلی دیوار دریا کے پانی کو تیزی سے کاٹتی جا رہی تھی۔ گدلا پانی بڑی تیز روانی کے ساتھ لہریں اٹھاتا جہاز کے دونوں طرف جا رہا تھا۔ یہاں ہوا کافی تیز تھی۔ یہاں لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگا ہوا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شاید یہ جہاز کی کمپنی کے نشان والا جھنڈا تھا۔ دور بائیں جانب سورج غروب ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ کنارے کے ناریل کے درختوں کے اوپر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ شام آ رہی تھی۔

سمندری جہاز ابھی تک دریائے ہگلی میں سے ہی گذر رہا تھا۔ دریا کے دونوں کنارے کافی دور دور ہوگئے تھے۔ میں ایک بار پھر اٹھ کر عرشے کے جنگلے کے پاس آگیا۔ میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ ڈوبتے سورج کی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر نیچے دریا کو دیکھا۔ دریا کے گدلے پانی میں سمندر کے پانی کی لہریں شامل ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ اسکا مطلب تھا کہ دریا کا ڈیلٹا قریب آرہا تھا جہاں دریا سمندر میں گرتا تھا۔ دریا کے پانی کا رنگ کبھی گدلا ہو جاتا' کبھی نیلا ہو جاتا۔ آگے خلیج بنگال کا کالا سیاہ سمندر تھا جس کا پانی دریا کے گدلے پانی میں مل کر نیلاہٹ مائل ہو رہا تھا۔ سورج کا سرخ تھال آہستہ آہستہ دور بہت دور دریا کنارے کے درختوں کی سیاہ لکیر کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ سردی بالکل نہیں تھی۔ ہوا میں سمندر اور دریا کی نمی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگانا چاہا لیکن تیز ہوا میں ماچس نہ جلا سکا۔ سردار صاحب کے پاس بیٹھ کر میں سگریٹ نہیں پینا چاہتا تھا۔

تھرڈ کلاس کے ڈیک میں سے لوہے کی سیڑھی نیچے تھرڈ کلاس کے لوئر ڈیک میں جاتی تھی۔ میں دھوتو نما ہوا دان کے قریب سے گذرا تو رک کر

اسے غور سے دیکھنے لگا۔ بحری جہازوں میں اس قسم کے گول اور اوپر سے ذرا جھکے ہوئے ہواوان اکثر آپ نے دیکھے ہوں گے۔ یہ ہواوان لوئر ڈیک کی ہوا باہر پھینکتے ہیں اور اوپر کی تازہ ہوا نیچے بھی لے جاتے ہیں۔ میں لوہے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے دوسری منزل کے سیکشن میں آگیا۔ یہاں سیکنڈ اور فسٹ کلاس کے کیبنوں کی طرف کوئی راستہ نہیں جاتا تھا۔ فسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے دوسری طرف راستہ تھا۔ یہاں سے لوہے کی سیڑھی سیدھی نیچے تھرڈ کلاس کے لوئر ڈیک میں جاتی تھی۔ یہ ڈیک بھی تھرڈ کلاس کے مسافروں کے لئے ہوتا ہے کہ اگر اوپر عرشے پر بارش ہو یا سمندر میں طوفان آجائے تو مسافر نیچے آجائیں۔

یہاں ایک چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی۔ کینٹین کیا تھی، بس ایک تنگ سا کاؤنٹر تھا جہاں ایک مدراسی بیٹھا حمام میں سے کافی نکال کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ میں نے بھی ایک پیالی کافی لی اور وہیں کھڑے کھڑے پینے لگا۔ جہاز ابھی دریا میں ہی تھا۔ سمندر میں داخل نہیں ہوا تھا، اسی لئے رولنگ بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ بس ایسے ہی دائیں بائیں غیر محسوس انداز میں ہل رہا تھا جیسے پرسکون دریا کی سطح پر کشتی قدرتی طور پر ہلتی ہے۔ کافی بڑی تلخ تھی۔ میں سگریٹ سلگا کر لوئر ڈیک میں آگیا۔ مسافر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اپنا اپنا سامان لئے بیٹھے تھے۔ لوئر ڈیک کافی کشادہ تھا اور لکڑی کے فرش پر کوئی کرسی وغیرہ نہیں تھی۔ مسافر زیادہ تر اس جگہ جمع ہو کر بیٹھے تھے جہاں اوپر چھت پر لگے ہواوان میں سے تازہ ہوا آرہی تھی۔ یہاں گرمی اور حبس تھا۔ کچھ برمی مسافر بھی میں نے دیکھے۔ انہوں نے کرتوں کے اوپر ریشمی دھوتیاں باندھ رکھی تھیں اور سروں پر زرد قرمزی رومال لپیٹے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا برمی بانس

کی بڑی سی ٹوکری کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا لمبا سگار پی رہا تھا۔ یہاں پیاز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں بوریوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ شاید بوریوں میں پیاز بھرا ہوا تھا۔ میں یہاں گرمی، حبس اور پیازوں کی بو میں زیادہ دیر کھڑا نہ ہو سکا۔

اوپر آیا تو تازہ ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ڈیک کی بتیاں روشن ہو گئیں تھیں۔ جہاز کچھ زیادہ ہی ہلنے لگا تھا۔ شاید وہ دریا کے ڈیلٹے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں سردار صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"کاکا! تم کہاں پھےےیاں ڈالتے پھرتے ہو، تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہی کہ نہیں؟"

بھوک مجھے لگ رہی تھی مگر کینٹین پر مجھے سوائے کافی اور بسکٹوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے کہا:

"یہاں کوئی کھانے پینے کی کینٹین ہی نہیں ہے۔"

سردار صاحب زور سے ہنسے۔ کہنے لگے:

"کاکا! یہاں بیٹھا رہو۔ کینٹین یہاں خود بخود آجائے گی۔"

اتنے میں جہاز کے وردی پوش ملازموں میں سے ایک لڑکا ادھر سے گذرا۔ سردار صاحب نے اسے آواز دے کر بلایا اور کہا:

"دو ٹھو کھانا لے کر آ اوئے۔ ایک مسلمانوں والا کھانا، ایک میرا کھانا، جا۔ نٹھ کے لا۔"

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"میرا مہینے دو مہینے میں ایک چکر کلکتے کا ضرور لگتا ہے۔ یہ کینٹین کے لڑکے سب مجھے جانتے ہیں۔ میں جھٹکا کھاتا ہوں۔ تمہارے لئے مسلمانوں والا حلال گوشت منگایا ہے۔"

تھوڑی دیر میں لڑکا دو کھانے لے آیا۔ میں کھانا کھانے لگ گیا۔ سالن میں خوب مرچیں تھیں۔ سردار صاحب کھانا بھی کھا رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"ہمارا جہاز سمندر میں کب داخل ہو گا؟"

"کاکا! آدھی رات کے بعد سمندر آجائے گا۔ یہ کالے پانی کا سمندر ہے، صبح اٹھو گے تو سمندر ہی سمندر ہو گا۔"

کھانا کھانے کے بعد میں وہیں ایک طرف لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جہاز آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔ مجھے بڑی جلدی نیند آگئی۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب ڈیک پر چاروں طرف دن کی روشنی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز پہلے سے زیادہ ڈول رہا تھا۔ سردار صاحب وہاں نہیں تھے۔ میں اٹھ کر ڈیک کے جنگلے کی طرف جانے لگا تو جہاز کی رولنگ کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لنگر والی مشین کی چرخی کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سنبھل کر اٹھا اور تیز تیز قدموں سے ڈیک کے جنگلے کے پاس گیا تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے خدا! چاروں طرف کالے پانی کا سمندر ہی سمندر تھا جو اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ زمین کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور تھوڑا تھوڑا جھک کر نیچے دیکھا۔ سمندر کی موجیں آگے جہاز کی نوک سے ٹکرا کر اتنی تیزی کے ساتھ پیچھے کو جا رہی تھیں کہ ذرا دیر دیکھنے سے میرا سر چکرانے لگا۔ جہاز بھی سمندر کی دیوہیکل لہروں کے

ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ ہوا بڑی تیز ہو گئی تھی۔ میرے بال اڑ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چل کر جہاز کے اگلے سرے پر آ گیا۔ لوہے کے کھمبے پر سے جہاز کا جھنڈا اتار لیا گیا تھا۔ یہاں جہاز کی دونوں دیواریں آ کر مل جاتی تھیں اور ایک تکون بن گئی تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ نیچے دیکھا تو جہاز کی نوکیلی دیوار سمندر کو چیرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لہریں جھاگ اڑاتی ہوئی پیچھے کو جا رہی تھیں۔ یہاں محسوس ہوتا تھا کہ جہاز بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی رفتار اتنی ہی تھی جتنی اس زمانے میں بھاپ یا ڈیزل سے چلنے والے جہازوں کی ہوتی تھی۔

اس جگہ ہوا کے تھپیڑے اتنے شدید تھے کہ میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ ہوا میں اس قدر نمی تھی کہ مجھے اپنے چہرے اور کپڑوں پر پانی کی پھوار سی پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں واپس سردار صاحب کے پاس آ گیا۔ اس وقت وہ اپنے سامان کے پاس بیٹھے ڈاڑھی کے بال باندھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے:

”کاکا! دیکھ لیا سمندر؟ جنگلے کے پاس مت جانا۔ جہاز کی رولنگ خطرناک ہوتی ہے۔“

میں نے سردار صاحب سے پوچھا:

”ہم رنگون کب پہنچیں گے؟“

سردار صاحب بولے:

”فکر نہ کر کاکا! تین دن میں پہنچ جائیں گے، تمہیں چکر تو نہیں آ رہے؟“

میں نے لاہور میں ہی سن رکھا تھا کہ سمندری جہاز میں بڑے چکر آتے ہیں مگر ابھی تک مجھے کوئی چکر وغیرہ نہیں آئے تھے۔ میں نے کہا:

"نہیں سردار جی۔"

سردار صاحب تھیلے میں سے گورمکھی کا کوئی رسالہ نکال کر اس کے ورق الٹنے لگے۔ بولے:

"میاں جی! ذرا جہاز کو کھلے سمندر میں جا لینے دو۔"

پھر میری طرف ذرا سا جھک کر کہا:

"ویسے اگر کوئی طوفان وغیرہ نہ آیا تو چکر وکر بالکل نہیں آئیں گے۔ لیکن اس موسم میں اس سمندر میں طوفان آجایا کرتے ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ جہاز کو کچھ نہیں ہو گا۔"

دوپہر کو بھی میں نے سردار صاحب کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ رات کو وہیں دری پر ایک طرف پڑ کر سو گیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب سردار صاحب زور زور سے ہلا کر جگا رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھ پر بارش کی بوچھاڑ پڑی۔

"کاکا! نیچے لوئر ڈیک پر چلو۔ سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔"

ہوا سیٹیاں بجاتی شور مچاتی چل رہی تھی۔ جہاز بری طرح ڈولنے لگا تھا۔ سردار صاحب نے اپنے سامان پر ترپال ڈال کر اسے دیوار کے ساتھ لگی ہک کے ساتھ باندھا اور دری سرہانہ بغل میں دبا کر لوئر ڈیک کو جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔ میں بھی ان کے پیچھے دوڑا۔ مگر جہاز اس طرف سے ہی اوپر کو اٹھ گیا۔ میں اور سردار صاحب اگر دیوار کے ساتھ لگی ریلنگ کو نہ پکڑتے تو پیچھے کی طرف گر پڑتے۔ جہاز اوپر اٹھ کر طوفانی موجوں کے

ساتھ نیچے کو آیا تو ہم جلدی سے دروازے میں سے نکل کر لوہے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔

لوئر ڈیک میں بھی جہاز اسی طرح ڈول رہا تھا جس طرح اوپر والے ڈیک پر ڈول رہا تھا۔ طوفانی سمندر میں سفر میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میرا جی متلانے لگا۔ میں بار بار غسل خانے میں جاتا۔ سردار صاحب کو کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ بڑے مزے سے دری پر بیٹھے تھے۔ بلکہ دوبارہ سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت رات کے ایک بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر سردار صاحب نے جلدی سے صندوق میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ کانسی کی کٹوری میں برانڈی ڈالی اور مجھے دے کر کہا:

"کاکا! یہ برانڈی پی جا۔ چکرو کر سب ختم ہو جائیں گے۔"

میں چکروں کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ جلدی سے ساری برانڈی پی گیا۔ برانڈی اندر گئی تو میرا جسم ایکدم گرم ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک چکر محسوس ہوتے رہے۔ پھر میرا سر اپنی جگہ پر قائم ہو گیا۔ چکروں کا احساس بالکل ہی ختم ہو گیا۔ جی متلانا بھی بند ہو گیا۔ سردار جی نے پوچھا:

"کیوں کاکا؟ چکر ٹھیک ہوئے کہ نہیں؟"

مجھے نقاہت ضرور تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا:

"ٹھیک ہو گئے ہیں۔"

"شاباش! لے ایک پیگ اور لگا لے۔"

انہوں نے مجھے برانڈی کا دوسرا پیگ بھی پلادیا۔ دوسرے پیگ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ میرے اندر تو ایکدم جیسے نئی توانائی آگئی۔ سردار صاحب بولے :

"اب پیٹ کو خالی مت رکھنا' لو یہ خشک میوہ کھاؤ۔"

انہوں نے مجھے بادام کشمش اور میوے کھلائے۔ سارا دن طوفانی بارش ہوتی رہی۔ جہاز بری طرح رولنگ کرتا رہا۔ لیکن برانڈی نے مجھے اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا تھا۔ میرے سارے چکر ختم ہو گئے تھے۔ ہم دن بھر اور رات کو بھی لوئر ڈیک میں ہی رہے۔ اگلے دن طوفان کی شدت کم ہوئی تو میں اوپر والے ڈیک پر گیا۔ جہاز ڈول رہا تھا۔ سمندر ایسے لگتا تھا جیسے چڑھا ہوا ہو۔ جہاز کے ڈیک سے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس فٹ نیچے سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ٹکرا رہی تھیں۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہ رہ سکا اور نیچے آگیا۔ چکروں سے مجھے نجات مل گئی تھی۔ تیسرے دن جہاز سنبھل گیا۔

سمندر میں کہیں کہیں دریا کا گدلا پانی نظر نظر آنے لگا تھا۔ میرے پاس ایک بزرگ مسافر بھی کھڑا تھا۔ اس نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"دریا کا ڈیلٹا شروع ہو گیا ہے۔"

جس طرح کلکتے سے ہم نے دریائے ہگلی میں سے سفر شروع کیا تھا اور سارا دن گذر جانے کے بعد سمندر کا پانی دریا میں ملنا شروع ہو گیا تھا۔ اسی طرح اب سمندر میں تین دن سفر کرنے کے بعد رنگون کے دریائے ایراوتی کا پانی سمندر کے پانی میں شامل ہونے لگا تھا۔ مگر ابھی تک زمین کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ دور دور تک سمندر ہی سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح ایک پوری رات پھر گذر گئی۔ اگلے روز سورج نکلا تو پہلی بار دور

زمین کے آثار ایک سیاہ دھبے کی شکل میں دکھائی دیئے۔ مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انسان کو زمین سے کتنی محبت ہے اور انسان کی زمین سے کس قدر قدرتی وابستگی ہے۔ اسکا مظاہرہ میں نے اس روز دیکھا۔ ہندو' مدراسی اور بنگالی ہاتھ جوڑ جوڑ کر دھرتی ماتا کو پرنام کر رہے تھے۔

جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا گیا' یہ سیاہ دھبہ پھیل کر لکیر کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ لکیر دریا کے کنارے میں تبدیل ہو گئی۔ ہمارا جہاز رنگون کے دریائے ایراوتی میں داخل ہو گیا تھا۔ سمندر ختم ہو گیا تھا۔ اب دریا کا گدلا پانی لہریں مار رہا تھا۔ دریا کے ایک کنارے پر کافی اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری طرف بودھی پیگوڈا یعنی گوتم بدھ کے مندروں کے سنہری کلس دھوپ میں چمکتے نظر آرہے تھے۔ پھر جہاز زمین میں سے ابھرے ہوئے بہت بڑے بڑے گول ٹینکوں کے قریب سے گذرا۔ کسی نے بتایا کہ یہ پٹرول کے ذخیرے ہیں۔ دوسرے نے کہا:

"یہ برما شیل کے پٹرول ڈمپ ہیں۔"

دوپہر تک جہاز دریائے ایراوتی میں سے گذرتا رہا۔ دریا کے دونوں کنارے' کناروں کے درخت اور گھنے جنگل کچھ فاصلے پر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر دریا کا پاٹ چوڑا ہو گیا' اور میں نے دیکھا کہ دائیں بائیں کتنے ہی اور سمندری جہاز کھڑے تھے۔ ہم رنگون کی بندرگاہ کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور لنگر ڈالنے والی مشین کے پاس آیا۔ سردار صاحب وہاں پر موجود نہیں تھے۔ میرا چھوٹا اٹیچی کیس وہیں پڑا تھا۔

میں نے وہ ہاتھ میں پکڑ لیا اور جہاز کے سامنے والے سرے کی تکون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ یہ بڑا خوبصورت نظارہ تھا۔ بندر گاہ کی عمارت بھی اب نظر آنے لگی تھی۔ ایک سٹیمر ہمارے جہاز کے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ آبی پرندے ہمارے جہاز کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ کیونکہ مسافر بچا کھچا کھانا وغیرہ دریا میں پھینک رہے تھے۔ دوپہر کے بعد ہمارا جہاز رنگون کی بندر گاہ کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ پلیٹ فارم یا وارف پر بندر گاہ کے مزدوروں نے ربڑ کے ٹائر جیٹی کی دیوار کے ساتھ ساتھ لٹکا دیئے تھے تاکہ جہاز کا پیندا پلیٹ فارم کی دیوار سے رگڑ نہ کھائے۔ جہاز پر ایک بار پھر وہی شور اور افراتفری مچ گئی جو جہاز پر چلتے وقت مچی تھی۔ تھرڈ کلاس کے ڈیک کے ساتھ جہاز پر سیڑھی لگا دی گئی۔ مسافروں میں ایک بار پھر دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ہر کوئی پہلے اترنے کی کوشش میں تھا۔ عورتیں بچوں کو، بچے ماؤں کو آوازیں دے رہے تھے۔

میں بھی مسافروں کے ہجوم میں شامل ہو گیا تھا اور ہجوم کے ساتھ ہی دھکے کھاتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاز پر لکڑی کا تختہ لگا تھا۔ اس پر سیڑھیاں نہیں بنی ہوئی تھیں۔ اگر سیڑھیاں بنی ہوئی ہوتیں تو مسافر ایک ایک سیڑھی پر منہ کے بل گرتے۔ سردار صاحب مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ دوسرے کئی سکھ مسافر بچوں کو کندھوں پر اٹھائے دھکے کھاتے، دھکے دیتے تختے سے اتر رہے تھے۔ جیسے ہی میں نے زمین پر قدم رکھا تو اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے زاہدہ یاد آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اسی زمین پر اسی شہر میں زاہدہ بھی اس وقت کہیں چل پھر رہی ہو گی۔ میں نے زور سے سانس لیا۔ یہ سوچ کر کہ اسی ہوا میں زاہدہ بھی سانس لے رہی ہو گی۔ جیٹی پر ایسا کوئی گیٹ نہیں تھا جہاں ٹکٹ چیک کرنے والا آدمی کھڑا ہو۔ دو بڑے گیٹ

تھے جو کھلے تھے۔ مسافر وہاں سے باہر جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتا باہر آگیا۔ سامنے ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ یہاں سے گذرا تو آگے سڑک آگئی۔ یہاں ہاتھوں سے چلانے والے رکشے اور ٹیکسیاں اور اس زمانے کی مینڈک کی طرح پھولی ہوئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سامنے کچھ بند گھوڑا گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ایسی گاڑیاں میں نے پرانی انگریزی فلموں میں دیکھی تھیں۔ ڈرائیور ایک اونچی سیٹ پر گاڑی کے ڈبے سے باہر بیٹھتا تھا۔ آگے گھوڑا جتا ہوا تھا۔ یہاں انگریزی کرنسی ہی رائج تھی۔ یعنی وہی روپے اور اکنی دونی۔ تین دن سمندری جہاز میں سفر کرنے کے بعد مجھے سخت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور کسی وقت ایسے لگتا تھا جیسے میں ابھی تک جہاز کے ڈیک پر کھڑا ہوں اور جہاز ڈول رہا ہے۔

حاجی اقبال صاحب نے مجھے اقبال فرنیچر مارٹ والے اقبال کے نام جو خط دیا تھا' وہ میری جیب میں تھا۔ چھوٹا اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور لپک کر میری طرف آیا اور بولا:

"چلے گا بابو؟"

میں نے کہا: "مغل سٹریٹ جانا ہے۔ کتنے پیسے لو گے؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے تین بار تالی بجا کر کہا:

"تین تالی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا:

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

ڈرائیور ہندوستانی لگتا تھا۔ یعنی صوبہ بہار یا صوبہ گجرات کا ہو گا۔

"نو روپے۔"

نو روپے اس زمانے میں بہت زیادہ تھے۔ میں نے کہا:

"پانچ روپے دے گا۔"

ڈرائیور بولا: "بیٹھے گا۔"

اس نے میرے لئے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی انجن سٹارٹ کر دیا۔ میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا اور ٹیکسی رنگون کی سڑکوں پر چل پڑی۔ رنگون کا شہر پہلی نظر میں مجھے کلکتہ شہر کا بچہ معلوم ہوا۔ ویسی ہی اونچی اونچی پرانی انگریزی طرز کی بھدی عمارتیں، کہیں کہیں فلیٹوں والی بلڈنگیں، فٹ پاتھ پر جھکے ہوئے سایہ دار درخت، بانس کی ریڑھیوں پر لدے ہوئے ناریل اور پپیتے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی کہ کئی جگہوں پر دکانوں پر انگریزی اور برمی زبان کے علاوہ اردو میں بھی بورڈ لگے تھے۔ برمی مرد سروں پر رومال باندھے نیلی، زرد اور قرمزی رنگ کی ریشمی دھوتیاں پہنے آ جا رہے تھے۔ برمی عورتوں نے سفید ململ قسم کے کپڑے کے کرتے پہن رکھے تھے جو ان کی کمر تک آتے تھے۔ نیچے عورتوں نے بھی ریشمی لہنگے پہنے ہوئے تھے۔ بالوں کے جوڑے بنائے ہوئے تھے۔ عورتوں، مردوں کے رنگ سفیدی مائل زرد تھے۔ ایک بوڑھی برمی عورت کو میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر دکان کے آگے کھوکھے پر بیٹھی لمبا سا سگار پی رہی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ سگار سفید رنگ کا تھا۔ ابھی دن پوری طرح نہیں ڈھلا تھا۔ دن کی روشنی کے باوجود بعض دکانوں کے اندر بجلی کے بلب روشن تھے۔ دھوپ نہیں تھی۔ کیونکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ جگہ جگہ درخت اگے ہوئے تھے۔ ناریل کے درخت

بہت تھے۔ ٹیکسی ایک بودھ مندر یعنی پیگوڈا کے قریب سے گذری۔ دو پھنگی یعنی بودھ بھکشو زرد لبادوں میں مندر سے باہر نکل رہے تھے۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بودھ بھکشوؤں کو برما میں پھنگی کہتے ہیں۔

ایک پان سگریٹ والی دکان پر میں نے نوجوان برمی لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ وہ پان لپیٹ کر گاہکوں کو دے رہی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رنگون میں پان سگریٹ کی دکانوں پر عورتیں بھی بیٹھتی ہیں۔ بعض گاہک دکان پر کھڑے پان لے کر کھا جاتے ہیں۔ جنہیں پان ساتھ لے جانے ہوتے ہیں۔ انہیں یہ عورتیں یا لڑکیاں کیلے کے پتے میں پان لپیٹ کر لونگ سے دبا کر بند کر کے دے دیتی ہیں۔ کئی بازاروں اور پارکوں اور مارکیٹوں سے گذرنے کے بعد ٹیکسی ایک بازار میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ ڈرائیور نے کہا:

"بابو! مغل سٹریٹ میں آگیا ہے۔"

میں نے کہا: "یہاں مسجد سلطان ٹیپو جہاں ہے' وہاں لے چلو۔"

ٹیکسی آگے چل پڑی۔ تھوڑے فاصلے پر ہی مجھے ایک بہت بڑے درخت کے پیچھے ایک مسجد کا گنبد' اسکا دروازہ اور دروازے تک اوپر کو جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ ٹیکسی درخت کے نیچے ایک طرف رک گئی۔

"یہ سلطان ٹیپو مسجد ہے۔ ادھر اترے گا۔"

میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی آگے چل دی۔ میں دکانوں کے اوپر لگے ہوئے بورڈ پڑھتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ایک دکان کے اوپر اقبال فرنیچر مارٹ کا اردو' انگریزی اور برمی زبان میں لکھا ہوا بورڈ لگا تھا۔ میں دکان میں داخل ہو گیا۔ کافی بڑی دکان تھی۔ ہر طرف لکڑی کا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق بھاری صوفے' پلنگ' سنگھار میز

اور کیبنٹ وغیرہ تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک بھاری جسم والا ادھیڑ عمر آدمی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے اور درمیان سے اڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی دکان کا مالک اقبال ہے۔ میں کاؤنٹر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے مجھے دیکھا تو فون پر کسی سے اردو زبان میں کہا:

"میں پھر بات کروں گا۔ خدا حافظ۔"

فون بند کر کے اس نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے پوچھا:

"فرمائیے۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے جیب سے کلکتے والے حاجی اقبال کا خط نکال کر انہیں دیا۔ خط پڑھ کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ اب ان کی چہرے پر وہ کاروباری مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کی جگہ کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے مجھے ان کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ کلکتے والے حاجی صاحب کے زیر بار احسان ہیں اور میرے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہیں۔ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے انہوں نے حاجی صاحب کی خیر خیریت پوچھی۔ میرے لئے چائے منگوائی اور بولے:

"برخوردار! آج کل یہاں کاروبار کا بڑا مندا ہے۔ جنگ لگی ہوئی ہے۔ لوگوں نے فرنیچر خریدنا بند کر دیا ہے۔ کوئی پتہ نہیں جنگ یہاں تک بھی پہنچ جائے۔ بہرحال حاجی اقبال میرے جگری دوست ہیں۔ انہوں نے تمہیں بھیجا ہے تو تمہاری میزبانی مجھ پر فرض ہے۔ میرے مکان پر تو کوئی جگہ اس وقت نہیں ہے۔ مہو سے میرے کچھ رشتے دار آج کل آئے ہوئے ہیں۔

ہاں تم اگر پسند کرو تو اس دکان کے پیچھے ایک کمرہ ہے' وہاں رہ سکتے ہو۔ کتنے دن یہاں رہو گے؟"

میں وہاں سیر و سیاحت کے لئے تو گیا نہیں تھا۔ میرا مقصد تو اپنی محبوبہ زاہدہ کو دیکھنا' اس سے ملنا تھا۔ میں نے کہا:

"سر! میں برما کے دوسرے شہروں کی بھی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ مہینہ دو مہینے تو لگ جائیں گے۔"

اقبال صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ سگار کی راکھ جھاڑی اور بولے:

"کوئی بات نہیں۔ تم جتنے دن چاہو' یہاں رہ سکتے ہو۔ باقی رہا نوکری کا معاملہ تو میرے بھائی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہیں نوکر رکھ سکوں۔ میں نے تو ایک ملازم کو پہلے ہی جواب دے دیا ہوا ہے۔ جنگ کی وجہ سے یہاں کے حالات کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ لیکن کھانے پینے کی تم بالکل فکر نہ کرو۔ تم میرے ساتھ ہی کھانا کھا لیا کرنا۔ آخر تم حاجی صاحب کے آدمی ہو۔"

پھر انہوں نے ایک بوڑھے ملازم کو آواز دے کر بلایا اور کہا کہ دکان کے پچھواڑے والا کمرہ میرے لئے کھول دیا جائے۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا:

"برخوردار! تم بڑے میاں کے ساتھ جا کر اپنا کمرہ دیکھ لو۔"

دکان کے پچھواڑے میں ایک تنگ سی سیلن زدہ راہ داری تھی۔ ایک طرف باتھ روم یا لیٹرین بنی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی وہ کمرہ تھا جو بڑے میاں مجھے دکھانے آئے تھے۔ یہ بڑے میاں ہندوستان کے شہر آگرہ کے رہنے

والے تھے۔ ایک عمر انھوں نے رنگون میں اقبال صاحب کے پاس گذار دی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر کہنے لگے:

"میاں! کمرہ چھوٹا ضرور ہے مگر گذارے کے لئے بہت ہے۔ تمہارے پاس بستر وغیرہ بھی نہیں ہے۔ تعجب ہے لاہور سے رنگون بغیر بستر کے ہی چلے آئے۔ خیر فکر نہ کرو، بستر بھی تمہیں مل جائے گا۔"

کمرے میں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا اور اندر گیلی لکڑی کی بو تھی۔ بڑے میاں نے بتی جلائی تو میں نے دیکھا کہ ایک تنگ سا کمرہ ہے۔ ایک طرف خستہ حال پلنگ بچھا ہے۔ پلنگ پر میلا سا گدا بچھا تھا۔ دروازے کے اوپر روشندان تھا جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے پاس دو سو کچھ روپے بچے ہوئے تھے۔ وہ میں نے دکان کے مالک اقبال صاحب کے پاس رکھوا دیئے کہ جتنی ضرورت ہوا کرے گی، لے لیا کروں گا۔ رات کو کمرے میں سونے لگا تو مچھروں نے حملہ کر دیا۔ پنکھا چلایا تو کچھ افاقہ ہوا۔ اتنی دور پردیس میں پہلی رات تھی۔ اچھی طرح سے نہ سو سکا۔ زاہدہ کے خیال نے بھی جگائے رکھا۔ جب خیال آتا کہ زاہدہ بھی اسی شہر کی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ اسی شہر کے کسی مکان میں سو رہی ہے تو دل میں اس کی محبت کا درد جاگ اٹھتا اور کسی وقت تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کاش زاہدہ کا بیاہ میرے ساتھ ہو جاتا۔

کسی نہ کسی طرح رات گذر گئی۔ صبح اٹھ کر نہادھو کر اٹیچی کیس میں سے نئی پتلون قمیض نکال کر پہنی۔ دکان ابھی تک بند تھی۔ راہداری میں سے گذر کر سڑک پر دکان کے سامنے آگیا۔ آسمان پر بادل بدستور چھائے ہوئے

تھے۔ بازار میں لوگ آجا رہے تھے۔ میں نے ایک چائے کی دکان میں بیٹھ کر ناشتہ کیا اور سگریٹ پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ زاہدہ سے کیسے ملاقات کی جائے۔

سب سے پہلے تو مجھے اس کے مکان کو تلاش کرنا تھا۔ میں صرف اتنی معلومات لاہور سے لے کر چلا تھا کہ زاہدہ کے خاوند مشتاق احمد کا رنگون میں کپڑے کا کافی بڑا بزنس ہے اور وہ اپنی بیوی اور میری محبوبہ زاہدہ کے ساتھ رنگون میں اکیلا رہتا ہے۔ صرف اتنی معلومات کو سامنے رکھ کر مجھے زاہدہ کے گھر تک پہنچنا تھا جو وقت طلب کام تھا۔ لیکن میرا جذبہ عشق صادق تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ میں زاہدہ تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں اقبال فرنیچر مارٹ کے مالک اور اپنے میزبان اقبال صاحب کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے ان سے پوچھا:

"یہاں رنگون میں پنجابی لوگ بھی کافی آباد ہوں گے۔"

اقبال صاحب نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا:

"ہاں میاں، یہاں ہندوستان کے تمام صوبوں کے لوگ کاروبار کرتے ہیں۔ ان میں پنجابی لوگ بھی بہت زیادہ ہیں۔"

میں نے کہا: "میرا ایک کالج فیلو ہے۔ وہ کہتا تھا کہ رنگون میں اسکا ایک انکل کپڑے کا کاروبار کرتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" اقبال صاحب نے پوچھا۔

میں انہیں زاہدہ کے خاوند کا نام نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:

"نام مجھے یاد نہیں رہا۔"

اقبال صاحب بولے:

"میاں! ویسے تو پنجابی لوگ یہاں مختلف علاقوں میں کپڑے' چمڑے' پھلوں اور غلے کا کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن فریزر سٹریٹ میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی مارکیٹ ہے۔ وہاں بھی پنجابیوں کی دکانیں ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے دوست کے انکل کی وہاں کوئی دکان ہو۔"

میرے لئے اتنی معلومات ہی غنیمت تھیں۔ میں کچھ دیر کے بعد دکان سے اٹھ کر فریزر سٹریٹ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

رنگون ایسا شہر تھا کہ جہاں اردو زبان عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ برمی' مدراسی' تامل' گجراتی' مارواڑی' سورتی' میمن اور مراٹھی ہمارے آپ کی طرح تو اردو نہیں بول سکتے تھے مگر ان کی اردو باقاعدہ سمجھ میں آجاتی تھی۔ مثلاً ایک آدمی سے خدا جانے وہ گجراتی تھا کہ مراٹھی یا تامل تھا' میں نے فریزر سٹریٹ کا پتہ پوچھا تو وہ بولا:

"ادھر والے بابو کو جائے گا۔ پھر برابر کو سیدھا ہو کر جانا مانگے گا۔ آگے تمہارے والا سٹریٹ آنے سکتا۔"

آنے سکتا یعنی آجائے گا۔ راستے میں اس قسم کی اردو کا میں نے ایک اور مظاہرہ دیکھا۔ وہ کسی دفتر کا احاطہ تھا۔ باہر بورڈ لگا ہوا تھا جس پر اردو انگریزی اور برمی زبان میں لکھا تھا۔

"ادھر گاڑی کھڑی کرنا نہیں سکتا۔"

یعنی ادھر گاڑی کھڑی کرنا منع ہے۔ صرف مقامی برمی لوگوں کو اس قسم کی اردو بولتے ہوئے دقت محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے کہ برمی زبان ہندوستان کی صوبائی زبانوں سے بالکل ہی الگ زبان تھی۔ اسکا سلسلہ یا رشتہ آگے تھائی لینڈ' لاؤس اور ویت نام' کوریا سے ہوتا ہوا آگے جاکر چینی زبان

سے مل جاتا تھا۔ برمی زبان میرے لئے بھی بالکل ہی اجنبی زبان تھی۔ جس طرح ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی زبانیں پھر بھی میری سمجھ میں کچھ کچھ آجاتی تھیں مگر جنوبی ہندوستان کی زبانیں تامل اور تلیگو بالکل ہی میری سمجھ سے باہر تھیں۔ تامل زبان آج کل کے صوبہ تامل ناڈو میں بولی جاتی ہے اور تلیگو زبان صوبہ آندھرا پردیش سابقہ حیدر آباد دکن کی سرکاری زبان ہے۔

رنگون میں زبان کے معاملے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ میں پوچھتا پوچھتا بڑی آسانی سے فریزر سٹریٹ میں آگیا۔ یہ سڑک ہمارے لاہور کے ٹمپل روڈ جتنی کشادہ تھی۔ آمنے سامنے انارکلی کی دکانوں ایسی بڑی شاندار دکانیں تھیں۔ جہاں ضروریات زندگی کی ہر شے فروخت ہوتی تھی۔ مجھے ایک کپڑے کی دکان دکھائی دی۔ کاؤنٹر پر ایک کالے رنگ کا بوڑھا تسبیح ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ سر پر اس نے گجراتیوں والی سفید جالی دار گول ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ سفید شرعی ڈاڑھی بھی تھی۔ میں نے جاکر السلام علیکم کہا۔ اس نے وعلیکم السلام کہا اور پوچھا:

"تمے کیا چاہئے بھائی؟"

میں اس لہجے سے واقف تھا۔ یہ گجرات کاٹھیاواڑ کا لہجہ تھا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ شخص زاہدہ کا خاوند مشتاق احمد نہیں ہے کیونکہ مشتاق احمد جوان تھا۔ اگرچہ میں نے مشتاق احمد کو اور مشتاق احمد نے مجھے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ذرا قریب ہو کر کہا:

"جناب یہاں کوئی مشتاق نام کا آدمی بھی کپڑے کا کاروبار کرتا ہے؟ مجھے اس کی تلاش ہے۔"

بوڑھے نے برجستہ کہا:

"تم مشتاق سیٹھ پنجابی کا پوچھتا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا: "ہاں۔۔۔وہ پنجابی ہے۔"

بوڑھا بولا: "ابھی اس نے اپنا شادی بنایا ہے۔ لاہور گیا تھا شادی بنانے۔"

میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔

"جی ہاں وہی سیٹھ مشتاق احمد صاحب۔"

بوڑھا بولا: "ارے بابا مشتاق سیٹھ پنجابی' بولو ناں' تم اس کا کیا لگتا ہے کہ تمہیں اس کی دکان کا بھی معلوم نہیں۔ ادھر دیکھو وہ باجو میں جو بورڈ لگا ہے' وہ مشتاق سیٹھ پنجابی کی دکان کا سائن بورڈ ہے۔ کیا سمجھ گیا؟"

میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور مشتاق سیٹھ پنجابی کی دکان کی طرف چلنے لگا۔ اب میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ زاہدہ کے خاوند نے مجھے کبھی نہیں دیکھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گا کہ میں اس کی بیوی کا عاشق ہوں اور اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے اس کی بیوی سے ملنے آیا ہوں۔ اور یہ ایک بری بات تھی۔

لیکن جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔

میں زاہدہ سے ملنے اس کو دیکھنے کے لئے سات سمندر پار کر کے رنگون پہنچا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس کے پاس جانا تھا۔ خواہ وہ اسکا برا مانے ' خواہ نہ مانے۔۔۔۔۔ میں مشتاق احمد پنجابی سیٹھ یعنی زاہدہ کے خاوند کی دکان کے سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک طرف فٹ پاتھ کے ستون کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس بازار کے فٹ پاتھ چھتے ہوئے تھے۔ جس طرح ہمارے لاہور کے شاہ عالم مارکیٹ کے فٹ پاتھ ہیں۔ یعنی اوپر بلڈنگوں کے فرش تھے جو فٹ پاتھ کی چھت تھی۔ فٹ پاتھ پر تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر رومن ٹائپ کے بڑے بڑے گول ستون کھڑے تھے۔

میں سامنے والی کپڑے کی دکان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دکان کے اوپر بہت بڑا بورڈ لگا تھا جس پر اردو اور انگریزی کے ابھرے ہوئے حروف میں "پنجاب کلاتھ سٹور" لکھا تھا۔ بہت عالی شان دکان تھی۔ اندر شیشے ہی شیشے لگے تھے۔ بتیاں جل رہی تھیں۔ چھت تک ریشمی کپڑوں کے تھان دور سے روشنی میں نظر آرہے تھے۔ دکان کے اندر جا کر بائیں ہاتھ کو ایک کاؤنٹر تھا جہاں سفید ڈاڑھی والا بوڑھا آدمی زرد رومال کاندھوں پر ڈالے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ مشتاق پنجابی سیٹھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی تک میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا کہ میں زاہدہ کے خاوند سے کیسے ملوں گا۔ یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ آیا میرا اس سے ملنا مناسب بھی ہے کہ نہیں۔ مجھے باقاعدہ کسی سکیم کے تحت اپنی محبوبہ زاہدہ تک رسائی حاصل کرنا تھی لیکن ابھی تک میرے ذہن میں کوئی سکیم نہیں آئی تھی۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں چمک اٹھا۔ یہ ایسا لاجواب خیال تھا کہ میں اپنے دماغ کی مکاری پر عش عش کر اٹھا۔ خیال کیا تھا' بڑی مناسب' موقع کے اعتبار سے موزوں اور کارگر سکیم تھی۔ چونکہ زاہدہ کے خاوند نے مجھے دیکھا ہوا نہیں تھا اور رنگون میں وہ بالکل اکیلا اپنی بیوی زاہدہ کے ساتھ رہتا تھا' اس اعتبار سے یہ سکیم بے حد ساز گار ثابت ہو سکتی تھی۔

میں ایک دم بڑا دلیر ہو گیا۔ ستون کی اوٹ سے نکلا اور سامنے پنجاب کلاتھ سٹور کی طرف چل پڑا۔ کپڑے کی اس دکان تک جاتے جاتے بجلی کی طرح میرے دماغ میں آئی ہوئی سکیم کی باقی جزئیات بھی یکے بعد دیگرے آتی چلی گئیں۔ دکان تک پہنچتے پہنچتے پوری سکیم میرے ذہن میں تیار تھی۔

دکان پر جا کر میں نے ڈاڑھی والے بزرگ سے پوچھا:

"مشتاق پنجابی سیٹھ کی یہی دکان ہے؟"

بزرگ نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولا:

"یہی دکان ہے پنجابی سیٹھ کی ۔۔۔ بولو' تم کیا مانگتا ہے؟"

میں نے کہا: "مجھے سیٹھ صاحب سے ملنا ہے۔ کلکتے سے آیا ہوں۔"

بزرگ نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک ملازم سے کہا کہ اندر جا کر سیٹھ کو اطلاع کرو۔ ایک لڑکا کلکتے سے آیا ہے ملنے کو ۔۔۔ ملازم

دکان کے پیچھے چلا گیا جہاں ایک دروازے پر ریشمی پردہ گرا ہوا تھا۔ دکان میں گاہک موجود تھے جن میں برمی اور ساڑھیوں والی ہندوستانی عورتیں بھی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے آکر کہا:

"سیٹھ بولتا ہے لڑکے کو اندر بھیج دو۔"

جب میں پردہ اٹھا کر چھوٹے سے سجے سجائے کمرے میں داخل ہوا تو یقین کریں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کچھ اس لئے کہ میں زاہدہ کے خاوند کے سامنے تھا اور کچھ اس لئے بھی کہ اب میرے جھوٹ پر جھوٹ بولنے کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میرے سامنے چمکیلی میز کے پیچھے چالیس پینتالیس سال کا پھولے ہوئے سانولے چہرے والا آدمی کرسی پر بیٹھا پان چبائے جا رہا تھا۔ اسکا سگار شیشے کے ایش ٹرے میں سلگ رہا تھا۔ بال خضاب سے کالے سیاہ ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اردو میں پوچھا:

"بولو بھائی۔۔۔ کلکتے سے تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

میں نے خالص پنجابی میں کہا:

"آپ کی بڑی شہرت سنی تھی' اس لئے آپ کو دیکھنے آگیا ہوں۔ آپ کا نام مشتاق صاحب ہے ناں؟"

مجھے پنجابی میں بات کرتے دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرایا۔ اس نے بھی پنجابی میں کہا:

"ہاں یار میں ہی مشتاق سیٹھ ہوں' تم پنجاب کے کس شہر سے آئے ہو؟"

میں نے کہا: ”جی میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔“

میں نے جان بوجھ کر اپنا مکان اس محلے میں بتایا جو زاہدہ کے ساتھ والا محلّہ تھا۔ مشتاق سیٹھ خوش ہو کر بولا:

”یار! اس کے ساتھ والے محلے میں تو میری شادی ہوئی ہے۔ اچھا بتاؤ' تم یہاں کیسے آئے ہو؟ کیا تمہاری فیملی بھی تمہارے ساتھ ہے؟ یہاں تمہاری نوکری لگی ہے کیا؟“

میں نے کہا: ”نہیں سیٹھ صاحب! نہ میری فیملی میرے ساتھ ہے' نہ میری کہیں نوکری لگی ہے۔ مجھے تو رنگون شہر کو دیکھنے کا شوق لاہور سے یہاں کھینچ لایا ہے۔ کلکتے کے ایک صاحب نے اقبال فرنیچر مارٹ کے مالک کے نام ایک خط دیا تھا کہ وہاں مجھے نوکری مل جائے گی۔ مگر انہوں نے جواب دے دیا ہے۔ آج ہی جہاز سے اترا ہوں۔ سر چھپانے کو جگہ نہیں۔ سوچتا ہوں کہیں چھوٹا موٹا کام مل جائے تو گزارہ بھی ہوتا رہے گا اور رنگون کی سیر بھی کر لوں گا۔

زاہدہ کے خاوند اور اپنے رقیب روسیاہ کے بارے میں' میں نے جو تصور قائم کیا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا سخت مزاج' خشک مزاج کاروباری ہو گا اور میری من گھڑت کہانی سن کر مجھے چائے وغیرہ پلا کر دکان سے چلتا کرے گا۔ مگر میرے تصور کے خلاف مشتاق احمد بڑا نرم دل کشادہ ظرف اور خوش اخلاق انسان نکلا۔ میری کہانی سن کر اس نے ہنستے ہوئے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا اور خالص پنجابیوں کی طرح بولا:

"کوئی گل ای نئیں یار۔۔ میں بھی پنجابی ہوں۔ لاہور میں میرے سسرال کا گھر ہے' اتنا بڑا کاروبار خدا نے دے رکھا ہے۔ اتنے سارے نوکر دکان پر کام کرتے ہیں۔ تم بھی کام شروع کر دو۔ کتنی جماعتیں پڑھے ہو؟"

میں نے کہا: "میٹرک کر لیا تھا۔ کالج میں داخل ہوا ہی تھا کہ رنگون شہر کے متعلق ایک انگریزی فلم دیکھی۔ یہ شہر مجھے اتنا اچھا لگا کہ تھوڑے بہت پیسے جمع کئے اور رنگون کی طرف چل پڑا۔"

مشتاق سیٹھ نے میرے لئے چائے اور بسکٹ منگوائے۔ کہنے لگا:

"تمہارا سامان کہاں ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس صرف ایک اٹیچی کیس ہی ہے جو اقبال صاحب کی دکان پر رکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا:

"وہ جا کر لے آؤ۔ دکان کے اوپر دو تین کمرے ہیں۔ تم ایک کمرے میں ٹک جاؤ۔ یہاں مارکیٹ سے روزانہ شام کو مال آتا ہے' بس اس کا حساب لکھ لیا کرو' کھانا پینا تمہارا ہمارے ذمے ہو گا۔ تنخواہ جتنی کہو گے' مل جائے گی۔ "

اپنی سکیم کامیاب ہوتے دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ میں نے زاہدہ کے خاوند کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"مجھے تنخواہ وغیرہ کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں تو یہاں سیر کرنے آیا ہوں۔ ایک دو مہینے رہ کر واپس لاہور چلا جاؤں گا۔"

"وہ تمہاری مرضی ہے۔"

میں اسی وقت واپس اقبال فرنیچر مارٹ پر گیا۔ وہاں سے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا۔ اقبال صاحب کو میں نے بالکل نہ بتایا کہ میں مشتاق پنجابی سیٹھ کے

ہاں ملازم ہو گیا ہوں۔ اس کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے یہی کہا کہ مجھے یہاں اپنے شہر کا ایک واقف کار مل گیا ہے۔ اس نے مجھے اپنے ہاں رہنے کو جگہ دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ مجھے نوکری بھی دلوا دے گا۔ اقبال صاحب نے مجھے خوشی سے جانے کی اجازت دے دی۔ شاید دل سے وہ بھی یہی چاہتے تھے۔

زاہدہ کے خاوند نے دکان کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ مجھے دے دیا جہاں ایک طرف کپڑے کے تھان کاغذوں میں لپٹے چھت تک لگے تھے۔ لوہے کا ایک پلنگ تھا جس پر گدا اچھا ہوا تھا۔ وہاں میرا بستر لگا دیا گیا۔ باتھ روم کمرے کے بالکل سامنے تھا۔ دوپہر کو زاہدہ کے خاوند کا کھانا گھر سے آیا تو اس نے مجھے بلا لیا۔ کہنے لگا:

"تم میرے شہر کے لڑکے ہو۔ اس لئے آج تم میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ گے۔ کل سے بے شک الگ کھا لیا کرنا۔"

زاہدہ نے آلو گوشت پکائے تھے۔ ساتھ روٹیاں تھیں' سلاد اور مچھلی کا اچار تھا۔ رنگون میں مچھلی کا اچار بڑے شوق سے لوگ کھاتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زاہدہ کے خاوند کے ساتھ بیٹھا زاہدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا رہا ہوں۔

اب میں اس جستجو میں رہنے لگا کہ کسی طرح زاہدہ سے آمنا سامنا ہو' اس سے ملاقات ہو۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ زاہدہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بہت حیران ہو گی۔ لیکن مجھے اس کی حیرانی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی محبت مجھے سات سمندر پار سے رنگون کھینچ لائی تھی۔ اب میں صرف اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس

سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور اس کے چلے جانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی تھی اور میں اس کو ملنے لاہور سے یہاں آگیا ہوں۔ اس میں اگر کوئی گناہ ہے تو ہو۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں تو زاہدہ کے عشق میں سر سے پاؤں تک شرابور تھا۔ اس کے اتنا قریب آکر اس سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔

مجھے وہاں کام کرتے تین دن گذر گئے۔ اس دوران زاہدہ بھی کبھی اپنے خاوند کی دکان پر نہ آئی۔ وہ آسکتی تھی۔ کیونکہ رنگون میں پنجاب کی عورتیں بھی پردہ نہیں کرتی تھیں۔ میں نے ابھی تک کوئی برقع پوش عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہر صوبے کی عورتیں وہاں آزادی سے پھرتی تھیں۔ مشتاق احمد یعنی زاہدہ کا خاوند دوپہر کا کھانا دکان پر ہی اپنے خاص خاص ملازمین کے ساتھ کھاتا تھا۔ ان میں ایک ہندوستانی خزانچی کبیر دین تھا' دوسرا وہ بوڑھا سفید ڈاڑھی والا تھا جو دکان کے کاؤنٹر پر کیش پر بیٹھتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مشتاق گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سوتا ضرور تھا۔ اس کے کمرے میں ہی ایک طرف بڑی پرانی طرز کی آرام کرسی پڑی تھی۔ وہ اسی پر قیلولہ کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دوپہر کا کھانا لانے روزانہ ایک میمن لڑکا دکان سے گھر جاتا ہے۔ زاہدہ سے ملنے کی دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو میں کسی روز میمن لڑکے کی جگہ خود گھر کھانا لینے چلا جاؤں۔ یا زاہدہ جہاں رہتی ہے' اس کا پورا پتہ معلوم کر کے جب سیٹھ سو رہا ہو تو اس کے پاس پہنچ جاؤں۔

ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ مشتاق سیٹھ کا گھر کہاں پر ہے۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ ابھی تک میں نے زاہدہ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اور میں اس سے ملنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس دوران میں نے مشتاق سیٹھ کے گھر کا

پورا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ رنگون شہر سے باہر سولی پیگوڈا کے پیچھے ایک سڑک بڑی گراؤنڈ کی طرف جاتی تھی۔ یہ گراؤنڈ جہاں ختم ہوتی تھی' وہاں مشتاق کا گھر تھا۔ اسکا نمبر 59 تھا۔ میں نے سوچا کہ جب مشتاق سیٹھ دکان پر دوپہر کو سو رہا ہو گا تو میں کوئی بہانہ بنا کر دکان سے کھسک جاؤں گا اور سیدھا اس کے گھر جا کر زاہدہ سے ملاقات کروں گا۔ اس میں ایک خطرہ تھا کہ اگر کسی نے مجھے وہاں دیکھ لیا اور مشتاق سیٹھ کو خبر ہو گئی تو وہ ضرور مجھ سے پوچھے گا کہ میں اکیلا اس کے گھر کیا لینے گیا تھا۔ اگر میں دوپہر کا کھانا لینے جاتا ہوں تو مجھ پر کسی کو شک نہیں پڑے گا۔

میمن لڑکا جسکی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی اور جو دکان میں ہی کام کرتا تھا' دوپہر کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کھانا لینے گھر جاتا تھا۔ مجھے کسی بہانے اسے روکنا تھا یا اسے کسی دوسری جگہ بھجوانا تھا کہ اس کی جگہ میں کھانا لانے کی پیشکش کر سکوں۔ لیکن یہ کام مشکل نظر آتا تھا۔ میمن لڑکا ہر وقت دکان پر ہی رہتا تھا۔ قدرت مجھ پر مہربان ہو رہی تھی۔ ایک دن میمن لڑکا نہ آیا۔ معلوم ہوا کہ آج اس نے چھٹی کی ہے۔ جب کھانا لانے کا وقت آیا تو مشتاق سیٹھ نے اپنے کمرے سے باہر نکل کر بوڑھے آدمی سے کہا:

"بڑے میاں! آج کھانا لانے کون جائے گا؟"

بڑے میاں بولے: "سیٹھ جی! لڑکا تو چھٹی پر ہے۔ دوسرا کوئی آدمی فارغ نہیں۔ میں خود لے آتا ہوں۔"

میں نے جھٹ اپنی خدمات پیش کر دیں:

"آپ کاؤنٹر نہ چھوڑیں۔ میں کھانا لے آتا ہوں۔ مجھے گھر کا ایڈریس بتا دیجئے۔"

مشتاق سیٹھ نے بڑے میاں سے کہا:

"ٹھیک ہے بڑے میاں! اسے گھر کا پتہ بتادو' یہ لے آئے گا۔"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر مشتاق سیٹھ نے کہا:

"یار لنچے پر بیٹھ کر جانا۔"

لنچے سے مراد ہتھ رکشا تھا جو رنگون میں عام چلتے تھے اور جسے مدراس کے مزدور پیشہ لوگ چلاتے تھے۔ انہیں قرنگی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ بڑے میاں مجھے مشتاق سیٹھ کے گھر کا ایڈریس سمجھانے لگے جو میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ میں نے دکان سے نکلتے ہی رکشا لیا اور اسے سولی پیگوڈا کے پیچھے گراؤنڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ قرنگی رکشا والے نے رکشے کو آگے سے اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔

ساتھ ساتھ وہ چھوٹی سی ٹلی بجاتا جاتا تھا جو اس نے ایک ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ جیسے جیسے رکشا زاہدہ کے مکان کی طرف جارہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ زاہدہ جب مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھے گی تو اس پر شدید ردعمل ہو گا۔

رکشا سولی پیگوڈا والی سڑک کا گول چکر گھوم کر گراؤنڈ کی طرف ہو گیا۔ یہ گراؤنڈ اصل میں ایک پارک تھی جہاں برمی لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ جب گراؤنڈ ختم ہوئی تو دائیں جانب لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مکان بنگلہ نما تھے۔ ان کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ ہر مکان کے آگے چھوٹا سا لان تھا جہاں کہیں کیلے اور کہیں ناریل کے درخت اگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے رکشا ٹھہرایا۔ رکشا والے سے کہا کہ تھوڑا انتظار کرے اور میں خود نمبر دیکھتا

مکانوں کے آگے سے گذرنے لگا۔ ایک جگہ مکان کے باہر چھوٹی سی تختی لگی تھی جس پر انگریزی میں مشتاق احمد سیٹھ لکھا تھا۔

میرا دل ایکدم دھک دھک کرنے لگا۔ یہ زاہدہ کا مکان تھا۔ زاہدہ اس مکان کے اندر اس وقت اپنے خاوند کے لئے کھانا تیار کر رہی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ دکان سے لڑکا کھانا لینے آرہا ہے۔ مکان کا چھوٹا سا گیٹ تھا جس کے اوپر بانس کی کمان سی تنی ہوئی تھی اور اس پر کوئی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ چھ سات قدم کا چھوٹا سا راستہ سامنے برآمدے میں جاتا تھا۔ جہاں ایک مدراسی نوکرانی فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہی تھی۔ برآمدے میں مکان کا دروازہ تھا جو بند تھا۔

میرا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور لان کے بیچ میں بنے ہوئے چھوٹے سے رستے پر سے گذر کر برآمدے میں آیا تو مدراسی نوکرانی نے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھے' میں نے کہا:

"میں دکان سے سیٹھ صاحب کا کھانا لینے آیا ہوں۔"

مدراسی نوکرانی نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا:

"وہ لڑکا کہاں ہے جو روز کھانا لے جاتا ہے؟"

میں نے کہا: "آج اس کی چھٹی ہے۔ اس سیٹھ نے مجھے بھیجا ہے۔"

مدراسی نوکرانی ساڑھی کا پلو کمر کے گرد لپیٹتی دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد واپس آکر کہنے لگی:

"اندر جاکر بیٹھ جاؤ۔"

میں کمرے میں آ گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ زاہدہ نے اسے بڑے سلیقے سے سجایا ہوا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر جالی دار پردے پڑے تھے۔ بانس کا صوفہ سیٹ تھا جس پر ریشمی گدیاں رکھی تھیں۔ کارنس پر زاہدہ کی شادی کے موقع پر اتاری گئی تصویر فریم میں لگی تھی۔ میں قریب جا کر تصویر کو دیکھنے لگا۔ زاہدہ دلہن بنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ادھیڑ عمر اور پھولے ہوئے گالوں والا اسکا خاوند مشتاق سیٹھ کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ زاہدہ کے کاندھے پر تھا۔ یہ تصویر انہوں نے شاید رنگون میں آ کر اتروائی تھی۔ زاہدہ دلہن کے لباس میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں کمرے میں اکیلا کھڑا تھا۔

اچانک اندر سے زاہدہ کی آواز آئی:

"آ کر کھانا لے جاؤ۔"

زاہدہ کو مدراسی نوکرانی نے یہی کہا ہو گا کہ آج دکان سے کوئی دوسرا لڑکا کھانا لینے آیا ہے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ دوسرا لڑکا دکان سے نہیں بلکہ لاہور سے صرف اس کو ایک نظر دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ کمرے میں ایک بغلی دروازہ تھا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ زاہدہ کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ میں پردہ اٹھا کر دوسری طرف چلا گیا۔ ادھر ایک چھوٹی سی راہ داری تھی جہاں مسالوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا آگے جا کر کچن کا دروازہ تھا جو کھلا تھا۔ میں خاموشی سے کچن میں داخل ہو گیا۔ زاہدہ کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ کاؤنٹر پر ٹفن کیریئر رکھے اسے بند کر رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر اونچی آواز میں کہا:

"لڑکے! آ کر کھانا لے جاؤ۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا:

"میں آگیا ہوں۔"

زاہدہ کا ہاتھ ٹفن کیریئر پر تھرتھرایا۔ شاید اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اس پر کچھ ایسا سکتہ سا طاری ہوا کہ مجھے لگا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔ میں نے زاہدہ کو سکتے کی حالت سے واپس لانے کی کوشش میں آگے بڑھ کر اسکا بازو تھام لیا اور جلدی جلدی کہا:

"زاہدہ مجھے معاف کر دینا۔ تمہاری محبت مجھے لاہور سے یہاں کھینچ لائی ہے۔"

زاہدہ کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنا بازو چھڑا کر ڈوبتی ابھرتی آواز میں کہا:

"تم نے اچھا نہیں کیا۔ چلے جاؤ۔ خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ"

زاہدہ کا رنگ اتنا زرد پڑ گیا تھا کہ میں ڈر گیا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ جلدی سے ٹفن کیریئر اٹھایا اور کچن سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر رکشا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں پتہ میں کب رکشے میں بیٹھا اور کب رکشا واپس روانہ ہوا۔ میرے ذہن میں بھی ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ زاہدہ کو دیکھ کر میرے اندر بھی جیسے سیلاب سا آگیا تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آرہا تھا۔ اس نے یہ کیوں کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔ زاہدہ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ میرے اس وقت کے احساسات تھے۔ آج اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد جب

میں ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زاہدہ نے ٹھیک کہا تھا۔ اس نے اسی ردعمل کا اظہار کیا تھا جو ایک وفادار بیوی کو کرنا چاہئے تھا۔

مگر میں تو آپ کو اس زمانے کے واقعات سنا رہا ہوں جب میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور عقل پر جذبات کی حکمرانی تھی۔ مگر میں آج بھی حیران ہوں کہ زاہدہ بھی نوجوان تھی۔ وہ بھی میری عمر کی ہوگی لیکن اس کی عقل پر جذبات کا غلبہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک شریف ماں باپ کی بیٹی ہے اور اس کا بیاہ ایک شریف آدمی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں کھانا لے کر دکان پر واپس آگیا۔ اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ ساری رات زاہدہ کی بے اعتنائی کا خیال پریشان کرتا رہا۔ بار بار یہ سوچ کر بے چین ہو جاتا کہ زاہدہ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ اس سے محبت کرنے والا اس کا محبوب اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکا اور اتنا لمبا سفر طے کر کے سمندر پار کر کے اس کے شہر میں پہنچ گیا ہے۔ رات کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ دوسرے روز میمن لڑکا آگیا۔ کھانا لینے وہی گھر گیا۔ میں صبح سے شام تک دکان پر رہا اور جو مال آتا رہا' اس کا حساب کتاب رجسٹر میں لکھتا رہا۔ مگر دماغ زاہدہ کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ تین دن اسی خود فراموشی کی حالت میں گذر گئے۔ چوتھے دن زاہدہ کی محبت کا بڑا شدید حملہ ہوا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج چاہے کچھ ہو جائے' میں زاہدہ کے پاس ضرور جاؤں گا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ کہنے ضرور جاؤں گا کہ اس نے میری محبت کی قدر نہیں کی۔ دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش بھی چھپی ہوئی تھی کہ زاہدہ کو پیار کروں گا۔ اس کے ہاتھوں کو چوموں گا۔

مجھے یہ احساس تک نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے شخص کی امانت ہے' دوسرے کی بیوی ہے اور اگر میں نے ایسا کیا تو یہ گناہ ہو گا۔

میں آپ کو اپنے دل کا حال پوری سچائی کے ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ جو اچھا کام میں نے کیا' وہ بھی لکھوں گا' جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا' وہ بھی بیان کروں گا۔ خدا مجھے معاف کرے۔۔۔!

میں نے پروگرام یہ بنایا کہ زاہدہ سے ملنے اسی وقت جاؤں گا جب اسکا خاوند یعنی مشتاق سیٹھ دکان میں دوپہر کے وقت سو رہا ہو گا۔ وہ دوپہر کے ایک ڈیڑھ بجے دوپہر کا کھانا کھاتا تھا اور دو بجے سے لے کر تین ساڑھے تین بجے تک سوتا تھا۔ میں نے صبح ہی مشتاق سیٹھ کو کہہ دیا کہ میرے دانت میں درد ہے۔ میں نے سکاٹ مارکیٹ کے ایک ڈاکٹر کو دکھایا تھا' اس نے آج بارہ بجے مجھے بلایا ہے۔ مشتاق سیٹھ بولا:

"میاں دانت کے درد کا ایک ہی علاج ہوتا ہے کہ دانت نکلوا دیا جائے۔ ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤ مگر دانت نکلوا کر آنا۔ دوائی وغیرہ کھانے سے کچھ نہیں ہو گا۔" میں پورے بارہ بجے دکان سے نکل گیا۔

میں نے یہ سوچا کہ اس وقت سیٹھ مشتاق گھر پر نہیں ہو گا۔ کیوں نہ میں پہلے ہی چلا جاؤں۔ زاہدہ کے پاس زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ میں جانتا تھا کہ زاہدہ مجھے دیکھ کر ایک بار پھر آگ بگولا ہو جائے گی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ میں اسے سنبھال لوں گا۔ آخر میں اس سے سچی محبت کرتا تھا۔ محبت اگر سچی ہو تو اسکا اثر ضرور ہوتا ہے۔ میں نے وہ وقت رنگون کے سولی پیگوڈا کے آس پاس چل پھر کر گذار دیا جس وقت دکان سے میمن لڑکے نے کھانا لینے آنا تھا۔ اس کے بعد میں زاہدہ کے بنگلے کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک درخت کے

درخت کے پیچھے بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں زاہدہ کے بنگلے پر لگی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے دکان والا میمن لڑکا کھانا لینے آیا۔ وہ بنگلے کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو کھانے والا بڑا ٹفن کیریئر اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بنگلے سے نکل کر بس سٹاپ کی طرف چل دیا جو بنگلوں کی قطار کے آخر میں کیولری گراؤنڈ کے کونے پر تھا۔ یہ کیولری گراؤنڈ چھوٹی سی گراؤنڈ تھی جہاں کچھ فوجی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ انگریزوں کی فوج کی کوئی رجمنٹ یہاں پر مقیم تھی۔ گراؤنڈ میں کچھ انڈین فوجی پریڈ کرتے نظر آیا کرتے تھے۔

میمن لڑکا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں درخت کے پیچھے سے نکل کر زاہدہ کے بنگلے میں آ گیا۔ برآمدہ خالی تھا۔ مدراسی نوکرانی وہاں نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ذرا سا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ دوسری طرف چھوٹا سا ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا۔ مجھے نوکرانی کا خیال تھا کہ وہ مجھے نہ دیکھ لے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوکرانی کی اس روز چھٹی تھی۔ مجھے کچن میں سے پانی گرنے اور برتن ادھر ادھر رکھنے کی آواز آ رہی تھی۔ زاہدہ دکان پر کھانا بھیجنے کے بعد برتن وغیرہ صاف کر رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہیں یہ مدراسی نوکرانی ہی نہ ہو۔ لیکن اب میں مکان کے اندر آ چکا تھا۔ میں تنگ سی راہ داری میں سے ہوتا ہوا کچن کے کھلے دروازے پر آیا تو دیکھا کہ زاہدہ فرش پر سے کیتلی اٹھا رہی تھی۔

”زاہدہ۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی چہرے پر غصے اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے محبت بھرے لہجے میں کہا:

"زاہدہ! میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگیا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ زاہدہ! مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔ میں تمہارے خاوند کا بھی بے حد احترام کرتا ہوں۔"

زاہدہ نے کیتلی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا:

"اگر میرے خاوند کا احترام کرتے ہو تو پھر اس کی غیر موجودگی میں یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں دو قدم چل کر کاؤنٹر کے قریب آگیا۔

"میں تو سمندر پار کر کے صرف تمہیں ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔ زاہدہ! تمہارے جانے کے بعد میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہیں یاد کرتا تھا۔ تمہاری شکل ہر وقت میری آنکھوں کے آگے رہتی تھی۔ میں تمہارے مکان کی خالی چھت کو دیکھتا تو مجھے تم وہاں کھڑی نظر آتیں۔ پھر غائب ہو جاتیں۔ میں نے سوچا کہ خودکشی کر لوں۔ پھر سوچا کہ ایک نظر تمہیں آخری بار دیکھ لوں۔ پھر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا۔"

میں بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا:

"زاہدہ! مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں دیکھنے' تم سے ملنے آیا ہوں۔ تمہیں دیکھ لیا ہے۔ تم سے مل لیا ہے۔ ناراض نہ ہونا' اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اب تم کبھی میری صورت نہیں دیکھو گی۔ میرے گھر والے بھی میری شکل نہ دیکھ سکیں گے۔ اس شہر کے باہر دریا بہتا ہے۔ میں اس دریا میں کود کر مر جاؤں گا۔ خدا حافظ!"

یہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ جب میں نے آخری جملہ کہا تو دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ! میں نے جھوٹ بولا ہے، مجھے معاف کر دینا۔ میرا خودکشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بس زاہدہ مجھے روک لے۔ ورنہ پھر مجھے زندہ حالت میں اس سے ملتے ہوئے شرم آئے گی۔ وہ کیا کہے گی کہ میں نے اس کی محبت میں مرجانے کا ارادہ کیا اور پھر زندہ رہا۔ خدا نے میری دعا قبول کر لی۔ میرے جھوٹ بولنے والے گناہ کو بخش دیا۔ جیسے ہی میں خدا حافظ کہہ کر مڑا۔ مجھے زاہدہ کی آواز آئی:۔

"ٹھہرو۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور وہیں رک گیا۔

زاہدہ میرے قریب سے ہو کر کچن کے دروازے میں سے گذری اور کہا: "میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے پچھلے کمرے میں لے گئی جہاں گھر کا فالتو سامان پڑا تھا۔ یہاں ایک پرانا صوفہ بھی دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ کھڑکی پر پردہ گرا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی شاید بنگلے کے عقبی لان کی طرف کھلتی تھی۔ کیونکہ اس میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کمرے میں آتے ہی وہ کہنے لگی:

"تمہیں عقل سے کام لینا چاہئے۔ پہلی غلطی تم نے یہ کی کہ میرے پیچھے پیچھے یہاں چلے آئے۔ اب دوسری غلطی یہ کر رہے ہو کہ میری خاطر اپنی جان دے رہے ہو۔ یہ باتیں دل سے نکال کر باہر پھینک دو۔ میں اب وہ زاہدہ نہیں ہوں جو لاہور میں اپنے مکان کی چھت پر اور قبرستان میں تمہیں ملتی تھی۔ میں اب ایک آدمی کی بیوی ہوں۔"

میں نے کہا:

"میں کب کہتا ہوں کہ تم کسی کی بیوی نہیں ہو۔ میں تمہارے اس رشتے کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن زاہدہ وہ محبت جو مجھے تم سے ہے، کم از کم اس کی تو بے عزتی نہ کرو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ تم نے خود مجھے آدھی رات کو مکان کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم قبرستان میں چھپ کر ملے تھے۔ کتنی محبت کی باتیں کرتے رہے تھے۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ نہیں زاہدہ وہ جھوٹ نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں دل کی گہرائیوں سے تم بھی مجھ سے پیار کرتی ہو۔ مگر تم مجبور ہو گئی ہو۔ تمہارے پیار کو تمہاری شادی کے چبوترے پر قربان کر دیا گیا ہے........"

میں بول رہا تھا۔ زاہدہ نڈھال سی ہو کر صوفے پر گر گئی۔ میں بھی اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں بولتا رہا:

"زاہدہ! ہم دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ خدا کے لئے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو۔"

زاہدہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اسکا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زاہدہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر میں نے پکڑے رکھا:

"میری محبت تو بالکل ایسی ہی محبت ہے کہ جیسے کوئی پھول سے محبت کرنے لگے۔ میری محبت تو صرف تمہارا دیدار چاہتی ہے۔ تمہاری آواز سننا چاہتی ہے۔ تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہے۔ تمہارے قریب رہنا چاہتی ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے زاہدہ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس کے چہرے کو اپنی طرف کیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں شیر ہو گیا۔ زاہدہ ابھی تک مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس کے دل میں ابھی تک میرا پیار موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرنے کی کوشش کی۔ زاہدہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی:

"نہیں، نہیں۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ تم اب چلے جاؤ۔ پلیز واپس لاہور چلے جاؤ۔ میری زندگی جیسی بھی گذرتی ہے گذرنے دو۔"

اس سے صاف ظاہر تھا کہ زاہدہ کو جس ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہے، وہ اس کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ اٹھارہ، انیس سال کی جوان لڑکی ایک ادھیڑ عمر آدمی کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے جو اس کے باپ کی عمر کا تھا۔ مگر زاہدہ طبعاً ایک نیک پارسا اور وفا شعار لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائیوں نے اسے جس کے پلے باندھ دیا تھا، وہ اسی کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو خوش رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں ایسی ان گنت مثالیں مل جائیں گی کہ ماں باپ نے مالی مجبوریوں کی وجہ سے جوان لڑکی کی شادی اس کی عمر سے تین گنا زیادہ عمر کے آدمی سے کر دی اور لڑکی نے ماں باپ کی عزت کو سینے سے لگا کر ساری زندگی بوڑھے خاوند کے ساتھ گذار دی۔ اگر خاوند مر گیا تو اپنی جوانی کے باقی دن بچوں کی پرورش کرتے اور خدا کی عبادت کرتے بسر کر دی۔

زاہدہ بھی اسی قسم کی لڑکیوں میں سے تھی۔ میں بھی صوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بے اختیار ہو کر زاہدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔ زاہدہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ نہ

چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں زاہدہ سے دل و جان سے محبت کرتا تھا۔ وہ واقعی میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ اس وقت میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ یہ اصلی اور سچی محبت کے آنسو تھے۔ ان آنسوؤں میں میری زاہدہ کے ساتھ محبت کی چمک اور پاکیزگی تھی۔ زاہدہ پر میرے آنسوؤں کا بہت اثر ہوا۔ اثر ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ یہ محبت کے پاکیزہ اور سچے آنسو تھے۔ زاہدہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میں نے اسکا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا اور روتے ہوئے کہا:

"زاہدہ! میں کیا کروں۔ تمہاری محبت نے میرے اندر آگ لگادی ہے۔ میں اس آگ کے شعلوں میں جل رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اتنی اجازت دو کہ جب تک میں یہاں ہوں، تمہیں کبھی کبھی آکر ایک نظر دیکھ لیا کروں۔"

زاہدہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اور بولی:

"مجھے پھر کب ملوگی۔ خدا کے لئے مجھے اپنا چہرہ دکھاتے رہنا۔ تم نہ ملیں تو میں مرجاؤں گا۔ اگر تمہیں دیکھے بغیر میں زندہ رہ سکتا تو لاہور سے اتنی دور یہاں نہ آتا......"

زاہدہ ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی:

"ابھی تم جاؤ۔ ایک ہفتے بعد مشتاق صاحب تین دن کے لئے مانڈلے جارہے ہیں۔ تم اتوار کی شام کو آجانا۔ اسی روز میں نوکرانی کو کسی بہانے بھجوادوں گی۔ اب تم جاؤ۔ اور پچھلی طرف سے جانا۔"

میں نے جرات سے کام لیتے ہوئے زاہدہ کو اپنے ساتھ لگالیا اور اس کے رخساروں کو چومنے کی کوشش کی۔ زاہدہ نے اپنا آپ پیچھے کرلیا اور

کمرے سے نکل کر راہ داری میں آگئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ یہ تنگ راہ داری بنگلے کے پچھلے برآمدے میں نکلتی تھی۔ وہاں عقبی صحن تھا جہاں کیلے کے درخت دیوار کے ساتھ ساتھ اگے تھے۔ یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ زاہدہ نے اس دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر کہا:

"اتوار کی شام کو آؤں گا۔"

زاہدہ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جلدی سے چلے جانے کو کہا۔ میں چھوٹے سے دروازے میں سے گذر کر بنگلے کے پیچھے جو کیولری گراؤنڈ والی چھوٹی سی سڑک تھی، اس پر آگیا۔

یہاں سے میں سیدھا بس سٹاپ پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ میرا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ مگر یہ خوشی کی دھڑکن تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری محبت نے زبردست فتح حاصل کی ہے۔ جیسے میرا سات سمندر پار کر کے زاہدہ کے پاس آنا رائیگاں نہیں گیا۔ ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ زاہدہ اب بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی تھی۔ اس کے دل میں آج بھی میرے لئے وہی پیار تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی بے بس عورت تھی۔ اگر اسکا بس چلتا تو وہ صرف مجھ سے شادی کرتی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی سے کبھی شادی نہ کرتی۔ میں اپنے جسم میں انبساط کی لذت انگیز لہریں محسوس کر رہا تھا۔

بس آئی اور میں اس میں بیٹھ کر واپس دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب مجھے بڑی شدت سے اتوار کے دن کا انتظار تھا۔ میں اس دوران یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا کہ کیا واقعی ہفتے بعد مشتاق سیٹھ مانڈلے جا رہا ہے۔ میں کسی سے پوچھتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں کسی کو شک نہ پڑ جائے کہ آخر

میں کیوں پوچھ رہا ہوں۔ اگرچہ اس شک کا کوئی بظاہر امکان نہیں تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ عشق میں ہر قدم پر بدگمانی کا گمان ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ دو تین دن گذر گئے۔

اتوار کے آنے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اس دوران میں نے ایک بار بھی زاہدہ کے گھر جانے کی کوشش نہ کی۔ کوشش کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے اتوار کی شام کو مجھے خود بلا رکھا تھا۔ اس دوران میرے کانوں میں بھنک پڑی کہ مشتاق سیٹھ ایک روز بعد کاروباری سلسلے میں مانڈلے جا رہا ہے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ زاہدہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد مشتاق سیٹھ یعنی زاہدہ کا خاوند مانڈلے چلا گیا۔ اب مجھے اتوار کا انتظار تھا۔ ایک ایک لمحہ بڑی مشکل سے گذر رہا تھا۔ ابھی اتوار کے دن میں دو روز باقی تھے۔ آخر اتوار کا دن آگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے شہروں میں بھی گھروں میں بہت کم ٹیلی فون لگے ہوتے تھے۔ زاہدہ کے مکان پر بھی ٹیلی فون نہیں تھا۔ اگر زاہدہ کے گھر فون لگا ہوا ہوتا تو میں ضرور اس دوران اسے کہیں نہ کہیں سے فون کرتا۔

اتوار کا دن گذرنے میں نہیں آتا تھا۔ صبح ہوئی تو دوپہر نہیں ہو رہی تھی۔ دوپہر ہوئی تو میں سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا۔ میں نے بڑے میاں سے کہا:

"بڑے میاں' آج میرا سینما میں فلم دیکھنے کا ارادہ ہے۔"

بڑے میاں خوش ہو کر بولے:

"فلم دیکھنی ہے تو خزانچی فلم دیکھنا۔"

اس زمانے میں رنگون میں لاہور کی بنی ہوئی فلم خزانچی ایک مقامی سینما میں تیرھویں' چودھویں ہفتے میں چل رہی تھی۔ اس فلم کے گانے رنگون کے ریستورانوں میں گراموفون پر خوب بجائے جاتے تھے۔ مثلاً 'ساون کے نظارے ہیں' والا گانا تو وہاں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اس فلم میں لاہور کے مشہور اداکار ایم اسمٰعیل نے کام کیا تھا۔ میں یہ فلم رنگون میں ایک بار دیکھ چکا تھا۔ دکان سے نکل کر میں سیدھا بس سٹاپ پر آ گیا۔

یہاں سے بس پکڑی اور سولی پیگوڈا کی عقبی گراؤنڈ کے سامنے والی فوجی بارکوں کی گراؤنڈ کے کونے والے بس سٹاپ پر اتر گیا۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ چھانے لگا تھا۔ رنگون شہر کی بڑی عمارتوں میں کہیں کہیں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ کیولری گراؤنڈ کی فوجی بارکوں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ میں زاہدہ کے بنگلے کے عقبی لان والے دروازے میں سے اندر گیا۔ یہ دروازہ نہیں تھا بلکہ چار فٹ کے دو ستون کھڑے کر کے درمیان میں ایک لوہے کا جنگلا لگا دیا گیا تھا۔ جنگلا کھلا تھا۔ عقبی لان کے چھوٹے برآمدے میں بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں برآمدے میں آ گیا۔ سامنے دائیں طرف اندر جاتی تنگ راہ داری کا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بند تھا۔ میں نے اسے ذرا سا دھکا دیا۔ دروازہ زاہدہ نے پہلے سے کھول رکھا تھا۔ دروازہ کھولنے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے راہ داری میں قدم رکھا۔ راہ داری کے کونے میں جو کچن تھا' اس میں سے زاہدہ باہر نکلی۔ اس نے نیلے رنگ کی ریشمی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ راہ داری کی چھت سے جو بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ میری طرف نہ آئی بلکہ اپنی جگہ پر کچن کے باہر ہی کھڑی رہی۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔

زاہدہ مجھے خاموشی سے دیکھنے لگی۔ اس نے ہلکا سامیک اپ کر رکھا تھا۔ بال گردن پر نیلے رنگ کے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ زاہدہ کے چہرے پر نہ مسکراہٹ تھی اور نہ پہلے دن والا خوف تھا۔ میں کچھ کہنے لگا تو زاہدہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اشارے سے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں سے مجھے ساتھ لے کر ایک اور دروازے سے گذری تو ہم بیڈ روم میں آگئے۔ سیٹھ مشتاق نے بیڈ روم شہزادوں کی طرح سجایا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کی ڈھو والا بڑا ڈبل بیڈ تھا جس پر عنابی رنگ کی ریشمی چادر پڑی تھی۔ مخمل کے تکیے لگے تھے۔ چھت کے درمیان فانوس لٹک رہا تھا۔ کونے میں قد آدم ریڈیو گرام رکھا تھا۔ کارنس پر چینی مٹی کے بنے ہوئے پریوں کے دو رنگین مجسمے سجے تھے جو پر کھولے مائل بہ پرواز تھیں۔ کارنس کے اوپر دیوار کے ساتھ سیٹھ صاحب کی بڑی سی رنگین شادی کی تصویر لگی تھی۔ تصویر کے اوپر لمبا کلاک تھیں جس کی ٹک ٹک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

زاہدہ نے بیڈ روم کی صرف ایک سرہانے والی بتی روشن کی تھی۔ ڈبل بیڈ کے پہلو میں بید کا صوفہ سیٹ لگا تھا۔ میں اور زاہدہ اس صوفہ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے بیڈ روم کا جائزہ لیتے ہوئے زاہدہ سے کہا:

"اس بیڈ روم کو دیکھ لگتا ہے کہ یہاں بڑا خوش قسمت جوڑا رہتا ہے۔"

زاہدہ نے ایک اکتائی ہوئی نگاہ بیڈ روم پر ڈالی اور کہا:

"دل کا حال تو سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں۔"

میں نے کہا: "زاہدہ اگر تمہیں یہ شادی پسند نہیں تھی تو تم نے انکار کیوں نہ کیا۔ ہمارا مذہب بھی ہمیں یہ حق دیتا ہے۔"

زاہدہ نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تمہیں کیا معلوم کہ لڑکیاں اپنے گھروں میں کتنی مجبور ہوتی ہیں۔ کتنی بے بس ہوتی ہیں' ہماری کون سنتا ہے۔ جب مجھے پتہ چلا تھا کہ میری شادی ایک ایسے مرد سے کی جا رہی ہے جو مجھ سے تین گنا زیادہ عمر کا ہے تو میں دل تھام کر رہ گئی تھی۔"

میں نے پوچھا: "آخر تمہارے گھر والوں نے یہاں تمہاری شادی کیوں کر دی ہے؟ تمہارے لئے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔"

زاہدہ بولی: "میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جو ہونا تھا' وہ ہو گیا۔ اب مٹی پھرولنے سے کیا فائدہ۔"

پھر اس نے بات کا موضوع بدلتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا:

"میں نے تمہیں یہاں اس لئے بھی بلایا ہے کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"مثلاً کونسی باتیں؟" میں نے ذرا آگے جھک کر پوچھا۔

زاہدہ نے میرا نام لے کر کہا:

"میرے دل میں تمہاری محبت کی بڑی قدر ہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر تم ابھی تک اس بات کو سمجھ نہیں سکے ہو کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ تمہاری محبت میرے دل میں ضرور موجود ہے مگر میں نے اسے اپنے دل کے تہہ خانے میں بند کر کے اسکا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ اب میں اپنے

خاوند کی امانت ہوں۔ میرا ضمیر اور دین مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں تم سے محبت کا اظہار کروں۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے سچا پیار ہے تو پھر اس پیار کے تقدس کو مجروح نہ کرو۔"

زاہدہ کی گفتگو میرے جذبات کو مجروح کر رہی تھی۔ میں نے اسکی بات کاٹ کر کچھ جھنجھلا کر پوچھا:

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

زاہدہ نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا:

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ تم دل میں کیا خیال لے کر سمندر پار کا سفر طے کر کے میرے پاس آئے ہو۔"

میں نے کہا: "میں صرف تمہاری محبت میں بے قرار ہو کر آگیا ہوں۔ میں اس لئے آگیا ہوں کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

زاہدہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"یہ جذباتی باتیں ہیں۔ سب زندہ رہ لیتے ہیں۔ اور پھر کیا تمہیں میری بدنامی کا خیال نہیں آیا؟ تم نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ تمہارے رنگون آنے سے اگر اس محبت کا راز میرے خاوند پر کھل گیا تو میری ازدواجی زندگی برباد ہو سکتی ہے۔ میرے گھر کا سکون تباہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے زاہدہ کو وہیں روک دیا اور کہا:

"میں یہ باتیں نہیں سنوں گا۔ تم مجھے صرف صاف صاف بتا دو کہ تم کیا چاہتی ہو۔"

زاہدہ نے کہا: "میں یہ چاہتی ہوں کہ اگر تم واقعی مجھ سے پیار کرتے ہو تو مجھے بھول جاؤ۔ اس ہفتے رنگون سے جو سمندری جہاز کلکتے جا رہا

اس میں سوار ہو کر واپس چلے جاؤ' اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ اسی میں میرے گھر کی عافیت ہے۔"

میں بھی جذبات میں آ گیا میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے صرف اتنا کہا:

"اگر تم یہی چاہتی ہو تو ایسے ہی ہو گا۔ آج کے بعد تم میری شکل نہیں دیکھو گی۔"

یہ کہہ کر میں بیڈروم سے نکل گیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

زاہدہ نے بھی مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ مجھے روکتی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ میں اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں۔ جب میں اس کے بنگلے سے نکل کر کیولری گراؤنڈ والے بس سٹاپ کی طرف جارہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ فوجی بارکوں کے باہر بتیاں جل رہی تھیں۔ پس منظر میں رنگون کی بلند بلڈنگوں میں بھی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کب بس آئی' وہ کونسی بس تھی' وہ کہاں جارہی تھی۔ ایک بس آکر رکی۔ میں اس میں سوار ہوا اور بس چل پڑی۔ کنڈکٹر نے مجھ سے پوچھا تو میں نے یونہی کہہ دیا: "پلاڈیم سینما۔" اس نے پلاڈیم سینما والے سکوائر کا ٹکٹ مجھے دے دیا۔ پلاڈیم سینما میں نے اس لئے کہہ دیا تھا کہ میں اس وقت مشتاق سیٹھ کی دکان پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرا دل زاہدہ کی محبت کے غم سے بوجھل تھا۔ اور آنکھوں میں بار بار آنسو آجاتے تھے جنہیں میں بس میں بیٹھا بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھا۔

پلاڈیم سینما والا اسکوائر آیا تو میں بس سے اتر گیا۔ سامنے سینما ہاؤس تھا۔ خدا جانے کونسی فلم لگی ہوئی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور گیلری میں آکر بیٹھ

گیا۔ فلم شروع ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ اتنا یاد ہے کوئی انگریزی فلم تھی۔ میری نگاہیں سینما کی سکرین پر تھی اور ذہن زاہدہ کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ کبھی سوچتا کہ اس نے میری محبت کو ٹھکرادیا ہے' اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کبھی خیال آتا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے' ٹھیک کیا ہے۔ وہ آخر ایک شخص کی بیوی ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں اس کے خاوند کی غیر موجودگی میں اس سے ملنے جاتا۔ آنکھوں میں بار بار آنسو آرہے تھے۔ فلم آدھی ختم ہوئی تو میں سینما ہاؤس سے باہر آگیا۔

رنگون شہر کی سڑکوں سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہوگئی تھی۔ سوچا واپس دکان پر ہی چلتا ہوں۔ دکان پر آیا تو بڑے میاں کاؤنٹر پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

"کیا فلم دیکھنے نہیں گئے؟"

میں نے یونہی کہہ دیا: "نہیں۔"

اور دکان کی دوسری طرف سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بتی جلائی۔ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد بے اختیار میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جی بھر کر رویا۔ رونے سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوگیا۔ اب صاف ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا میں واپس لاہور چلا جاؤں؟ رنگون میں رہنے کا کوئی مقصد اب نہیں رہا تھا۔ ایک دم زاہدہ کی محبت نے جوش مارا۔ اس کی شکل آنکھوں کے سامنے آگئی۔ دل نے کہا۔ "نہیں' یہاں سے واپس جاکر کیا کروگے۔ وہاں بھی تمہیں زاہدہ کی یاد چین نہیں لینے دے گی۔ رنگون میں رہوگے تو کم از کم کسی نہ کسی وقت زاہدہ کو اپنے سامنے تو دیکھ لیا کروگے' اس کے گھر نہ جاؤ' مگر یہ احساس تو رہے گا کہ جس فضا میں تم

سانس لے رہے ہو' اسی فضا میں تمہاری محبوبہ بھی سانس لے رہی ہے' اپنی محبت کی قربانی دے دو۔ زاہدہ کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر دو۔ اس کی یاد کو اس کے خیال کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے در پر باقی زندگی گزار دو۔ لاہور واپس گئے تو زاہدہ سے دوری کا احساس تمہیں زندہ نہ رہنے دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں زاہدہ کی محبت میں سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا تھا۔ محبت بڑی خطرناک چیز ہے' آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ جذبات کا ایک بپھرتا ہوا سمندر ہے اور نوجوانی کی محبت تو بالکل اندھی ہوتی ہے۔ آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔

میں نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ میں رنگون میں ہی رہوں گا۔ مشتاق سیٹھ کی دکان پر ہی نوکری کروں گا لیکن زاہدہ کے گھر کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔ کسی سے اسکا ذکر تک نہیں کروں گا۔ اس سے ملنے کی کبھی کوشش تک نہیں کروں گا۔ اگر کبھی مشتاق سیٹھ نے کسی کام سے گھر بھیجا تو کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ صرف اس امید پر دن گذاروں گا کہ کسی نہ کسی وقت تو زاہدہ اپنے خاوند کی دکان پر آئے گی۔ بس وہیں دور سے اس کا دیدار کر لیا کروں گا۔ یہ محبت کا منفی اور زبوں ہمتی کا پہلو تھا۔ مگر میں نے اس زبوں ہمتی کو قبول کر لیا تھا۔ صرف اس لئے کہ میں زاہدہ کی محبت میں غرق ہو چکا تھا۔

زاہدہ کا خاوند مانڈلے سے واپس رنگون آگیا۔ وقت آہستہ آہستہ گذرنے لگا۔ زاہدہ سے ملے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا کہ ایک دن شام کے وقت زاہدہ مشتاق سیٹھ کی پرانی ماڈل کی ٹرانف گاڑی میں بیٹھ کر دکان پر آگئی۔ نئے ڈیزائن کے کچھ تھان ہانگ کانگ سے ایک دن پہلے آئے تھے۔ وہ انہیں دیکھنے آئی تھی۔ میں اس وقت دکان کے کونے میں سٹول پر بیٹھا رجسٹر

پر حساب لکھ رہا تھا۔ زاہدہ نے سبز رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے پورا میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ بڑے میاں اسے دیکھ کر کاؤنٹر چھوڑ کر اٹھے اور سلام کر کے اسے ساتھ لے کر اس کے خاوند کے کمرے کی طرف بڑھے۔ زاہدہ نے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مجھے دکان میں دیکھ کر اس کے چہرے سے حیرت یا تعجب کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ زاہدہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ میں رنگون میں ہی ہوں اور واپس لاہور نہیں گیا۔ وہ خاموشی سے میرے قریب سے گزر گئی اور اپنے خاوند کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

میں رجسٹر ایک طرف رکھ کر چپکے سے اٹھا اور نوکر سے یہ کہہ کر کہ میں سگریٹ لینے جا رہا ہوں' دکان سے نکل کر سامنے والے ریستوران میں چلا گیا۔ چائے منگوائی اور چائے کا کپ سامنے رکھ کر دکان کی طرف تکتا رہا۔ زاہدہ کچھ دیر اپنے خاوند کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ پھر وہ اس کے ساتھ کمرے سے نکلی اور نئے ڈیزائن کے کپڑوں کے تھان دیکھنے لگی۔ وہ نیا کپڑا بھی دیکھ رہی تھی اور مسکرا مسکرا کر اپنے خاوند سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس کو اپنے خاوند کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر میرے سینے پر جیسے سانپ لوٹ رہا تھا۔ یہ میرے دل کی خباثت تھی یا شدید محبت کا اثر تھا' میں کچھ نہیں جانتا۔ بس اس وقت میں رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔ میں ریستوران سے باہر نکل گیا۔

کونے والی دکان پر جا کر سگریٹ کا پیکٹ خریدا۔ ایک سگریٹ سلگایا اور وہیں فٹ پاتھ پر کھمبے کے ساتھ ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ میرا حلق بار بار کڑوا ہو رہا تھا۔ سگریٹ بد ذائقہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے

سگریٹ سڑک پر پھینک دیا اور یونہی بازار میں چلنے لگا۔ دکانیں روشن تھیں۔ برمی عورتیں' ہندوستانی عورتیں اور مرد میرے قریب سے گذر رہے تھے مگر میں ان سب سے بے خبر تھا۔ میں اپنے آپ میں گم تھا۔ مجھے لاہور والا زاہدہ کا مکان یاد آرہا تھا' جب آدھی رات کی سردی میں وہ میرے پاس بیٹھی تھی اور میں اس کا گرم ہاتھ' اپنے گرم ہاتھ میں لئے اس سے محبت کی باتیں کر رہا تھا۔ پھر مجھے لاہور کے اس قبرستان کی دوپہر یاد آئی جب زاہدہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی اور ہم دونوں باتیں کر رہے تھے۔ محبت کی باتیں' ایک دوسرے کو ہمیشہ یاد رکھنے کی باتیں۔۔۔۔ ایک دوسرے کو کبھی نہ بھلانے کی باتیں۔

نہ جانے کب تک میں رنگون کے بازاروں میں خود فراموشی کے عالم میں پھرتا رہا۔ جب دکان پر واپس آیا تو زاہدہ جا چکی تھی۔ بڑے میاں نے مجھ سے پوچھا:

"میاں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ سیٹھ صاحب دوبار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور سیدھا زاہدہ کے خاوند مشتاق سیٹھ کے کمرے میں چلا آیا۔ سیٹھ نے رجسٹر پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور کہا:

"بیٹھ جاؤ۔"

میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں سیٹھ کو پتہ تو نہیں چل گیا کہ جب وہ مانڈلے گیا ہوا تھا تو میں اس کی بیوی سے ملنے چوری چھپے اس کے گھر گیا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ سیٹھ رجسٹر پر کچھ لکھنے میں

مصروف رہا۔ پھر اس نے رجسٹر بند کر کے ایک طرف رکھا۔ اور کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر گہرا سانس بھر کر پان چباتے ہوئے بولا:

"میاں حالات کچھ خراب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ انگریزوں اور جرمنوں کی جنگ تیز ہوتی جا رہی ہے۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جس بات سے میں ڈر رہا تھا' وہ بات نہیں تھی۔ میں نے کہا:

"سیٹھ جی! جنگ تو یہاں سے بڑی دور لگی ہوئی ہے۔ رنگون میں تو امن و امان ہے۔"

سیٹھ نے سگار سلگایا۔ کہنے لگا:

"بھائی تم ابھی بچے ہو۔ ہم نے یہاں ساری عمر گزاری ہے۔ یہاں کے ماحول میں کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں' جنہیں تم محسوس نہیں کر سکتے۔"

میں خاموشی سے زاہدہ کے خاوند کی باتیں سنتا رہا۔ آگے سے کچھ نہ بولا۔ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد سیٹھ نے رجسٹر کے نیچے سے رنگون میں چھپنے والا اخبار "شیر برما" نکالا۔ اسے کھول کر ایک خبر پر نظریں جماتے ہوئے بولا:

"یہ دیکھو۔ بہت چھوٹی سی خبر ہے۔ سب سے نیچے دی ہوئی ہے۔ مگر بڑی خطرناک خبر ہے۔ لکھا ہے کہ ہندوستان سے ایک سمندری جہاز انڈین فوج کو لے کر رنگون کی طرف چل پڑا ہے۔ آگے لکھا ہے کہ رنگون میں ایسے برمی لیڈروں کے کوائف جمع کئے جا رہے ہیں جو انگریزوں کی حکومت کے خلاف ہیں۔"

پھر سیٹھ نے اخبار بند کر دیا اور بولا:

"لگتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔ ہانگ کانگ سے جو لوگ ہمیں مال بھیجتے تھے' انہوں نے آخری کھیپ بھیجنے کے ساتھ ہی پیغام بھجوایا ہے کہ مال کی اگلی کھیپ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب روانہ کریں گے۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ مشتاق سیٹھ مجھ سے اس قسم کی کاروباری باتیں کس لئے کر رہا ہے۔ دوسرے لمحے یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ سیٹھ نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے میری طرف جھک کر کہا:

"اگرچہ مجھے یہاں کاروبار کرتے ساری زندگی ہو گئی ہے۔ مگر مجھے یہاں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ تم میرے شہر کے ہو اور میرے صوبے کے رہنے والے ہو۔ میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا یہاں لاکھوں کا بزنس ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ رنگون میں حالات خراب ہو جائیں گے۔ یہاں کی برمی سیاسی جماعتیں انگریزوں سے نفرت کرتی ہیں اور اپنے ملک برما کو ان کے قبضے سے نجات دلانا چاہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں برمی لوگ انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیں۔ توڑ پھوڑ ہونے لگے۔"

یہ بات سیٹھ مشتاق کے بھی گمان میں نہیں تھی کہ جاپان انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے والا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ برما میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے خلاف برمی لوگ توڑ پھوڑ کی کارروائی شروع کرنے والے ہیں اور ملک میں امن و امان کی فضا برقرار رکھنے کے لئے انگریز' انڈین فوجیوں کا جہاز بھر کر رنگون لا رہے ہیں۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ سیٹھ مشتاق مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ میں خود سیاست اور ملکی حالات سے بے خبر تھا۔ بس اردو اخبار کبھی کبھی دیکھ لیتا تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ یورپ میں انگریزوں اور جرمنوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ سیٹھ مشتاق کو

کسی کا فون آ گیا۔ وہ کچھ دیر فون پر برمی زبان میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔
باتیں ختم ہوئیں تو اس نے ریسیور رکھتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو کر کہا:

"اگر یہاں سیاسی گڑبڑ شروع ہو گئی تو مجھے صرف ایک ہی فکر ہے کہ میری بیوی گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ یہ برمی لوگ اندر اندر سے ہم ہندوستانی اور خاص طور پر پنجابی سوداگروں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے ملک میں آ کر ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خود ست الوجود اور نااہل ہیں۔ محنت سے کوئی کام کرنا نہیں جانتے۔"

میرا ذہن زاہدہ کے خاوند کے اسی ایک جملے پر اٹکا ہوا تھا کہ میری بیوی گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ سیٹھ نے کہا:

"ویسے ابھی حالات بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور ابھی اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو تمہاری ڈیوٹی یہ ہوگی کہ میری بیوی کو ساتھ لے کر سیدھے مےمیو پہنچ جاؤ۔ وہاں میرا ایک دوست اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ بھی بزنس کرتا ہے۔ تم وہاں میری بیوی کے پاس اس وقت تک رہو گے' جب تک کہ رنگون میں حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں صرف تم پر ہی بھروسہ کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا: "میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ آپ جو کام میرے ذمے لگائیں گے' میں اسے پوری ذمہ داری سے کروں گا۔"

مشتاق سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا: "شاباش! اب تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

میں اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا اور اپنا رجسٹر لے کر بیٹھ گیا۔ ایک دن پہلے کا کچھ حساب لکھنا رہ گیا تھا' اسے پورا کرنے لگا۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ زاہدہ کو لے کر میمیو جاؤں گا تو وہاں اس کے پاس بیٹھنے' اس سے باتیں کرنے اور کچھ نہیں تو اس کو دیکھنے کا تو ہر وقت موقع ملتا رہے گا۔ میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ رنگون میں انگریزوں کے خلاف جلدی گڑبڑ شروع ہو۔ جلدی حالات خراب ہوں تاکہ سیٹھ مشتاق مجھے زاہدہ کے ساتھ میمیو بھیج دے۔ مگر قدرت ہمارے ان پروگراموں پر مسکرا رہی تھی۔ نہ مجھے پتہ تھا اور نہ سیٹھ مشتاق کو علم تھا کہ قدرت ہمیں کتنے بڑے عذاب میں ڈالنے والی ہے۔ ایک ایسا اذیت ناک عذاب کہ جس کی الم ناک یادوں کو ہماری نسلیں بھی فراموش نہ کر سکیں گی۔

رنگون میں ایک طرح سے ہر طرف امن و امان تھا۔ موسم رخ بدل رہا تھا۔ اخباروں میں جنگ کے بارے میں روز خبریں چھپتیں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ رنگون شہر میں اردو کے دو اخبار چھپتے تھے۔ رنگون میں اردو بولنے اور اردو پڑھنے والوں کی بھاری آبادی تھی۔ ان اخباروں کے علاوہ برمی زبان کے اخبار میں بھی جنگ کے بارے میں خبریں شائع ہوتیں۔ رنگون کے ریڈیو سٹیشن پر دن میں آدھے گھنٹے کا اردو پروگرام ہوتا تھا۔ سیٹھ مشتاق کی دکان پر اردو کے دونوں اخبار یعنی شیر رنگون اور مجاہد برما آتے تھے۔ سیٹھ مشتاق کے کمرے میں ایک لکڑی کے ڈبے کی شکل کا اس زمانے کا ریڈیو بھی رکھا ہوتا تھا۔ اس ریڈیو پر اردو پروگرام کی خبریں بھی سنی جاتی تھیں۔

ان خبروں میں بتایا جاتا تھا کہ یورپ میں جرمن اور انگریز فوجوں کے درمیان بڑی گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے اور جرمن فوجوں نے یورپ

کے کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس زمانے میں میری جغرافیائی معلومات سکول کی کتابوں تک ہی محدود تھیں۔ ایک روز اخباروں میں خبر چھپی کہ اٹلی بھی جنگ میں شامل ہو گیا ہے۔ پھر خبر آئی کہ جرمن فوجیں، شمالی افریقہ میں داخل ہو گئی ہیں۔

اس قسم کی خبروں سے لوگ جنگ کے بارے میں گرمجوشی سے باتیں ضرور کرنے لگے تھے مگر کسی طرف سے بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا جارہا تھا۔ رنگون میں کاروبار ضرور ترقی کررہے تھے اور لوگوں کو جنگی سامان کی سپلائی کے نئے نئے ٹھیکے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ زاہدہ کے خاوند مشتاق سیٹھ کا بھی سپلائی کا کوئی ٹینڈر منظور ہو گیا اور اسکی کاروباری مصروفیات بڑھ گئیں۔ اسے فوجی ٹرکوں پر ڈالنے والی ترپالوں کی سپلائی کا ٹھیکہ ملا تھا۔ مال تیار کروانے اور خام مواد مہیا کرنے کے سلسلے میں مشتاق سیٹھ شمالی برما کے دورے پر جاتا رہتا تھا۔ دولت کے لالچ میں وہ برما میں بڑھتی ہوئی انگریزوں کے خلاف نفرت کو بالکل ہی بھول چکا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں پھر کبھی مجھ سے بات نہ کی تھی۔ ایک بار ممیو کے دورے سے واپس آیا تو مجھے کمرے میں بلا کر کہنے لگا:

"یار! وہ میرا ممیو والا دوست تو اپنے سارے گھر بار کو لے کر کلکتے چلا گیا ہے۔ اسکے برمی بھائی والد سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنا حصہ اونے پونے داموں فروخت کر کے ہندوستان چلا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے خواب آیا تھا کہ برما کے سارے شہروں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ اس خواب سے ڈر کر برما چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

مشتاق سیٹھ ہنسنے لگا اور طنزیہ انداز میں بولا:

"میاں کاروبار کرنے کے لئے بڑا جگرا چاہئے۔ خوابوں پر یقین رکھنے والے کاروبار نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کو تو اپنے گھر میں بیٹھے رہنا چاہئے۔"

مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کیونکہ اپنی محبوبہ زاہدہ کے ساتھ ہ ہ ہ و جانے کا میرا خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔ میں نے مشتاق سیٹھ سے پوچھا:

"سیٹھ جی! اگر حالات خراب ہوئے تو پھر ہم لوگ کیا کریں گے؟"

میرا مطلب یہ تھا کہ اگر رنگون میں بقول سیٹھ صاحب کے سیاسی گڑبڑ اور توڑ پھوڑ شروع ہو گئی تو وہ میرے ساتھ زاہدہ کو کہاں بھیجے گا۔ مشتاق دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا:

"ارے یار! اب حالات خراب نہیں ہوں گے' انگریزوں نے مخالف برمی سیاسی پارٹیوں کے سب لیڈر گرفتار کر لئے ہیں۔ میاں انگریز آخر حاکم ہے' ان سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا۔"

یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کا اظہار تھا۔ مشتاق سیٹھ کو ملٹری کے ٹھیکے سے لاکھوں کی آمدنی ہو رہی تھی۔ لہٰذا وہ انگریز حکومت کی تعریفیں کرنے لگا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ حالات نے یک لخت پلٹا کھایا۔ ایک روز صبح کے اخباروں میں یہ تشویش ناک خبر چیختی' دھاڑتی سرخیوں کے ساتھ چھپی کہ جاپان نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ سارے رنگون شہر میں اضطراب اور پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ رنگون میں رہنے والے ہندوستانی پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ کیونکہ جنگ ان کے خطے میں بلکہ ان کے گھر کے صحن میں پہنچ گئی تھی۔ اس روز زاہدہ کا

خاوند مشتاق سیٹھ بھی گھر سے دکان پر آیا تو سخت پریشان تھا۔ گھر سے وہ اخبار اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ دکان میں ہر ملازم کا چہرہ پریشان پریشان تھا۔ بڑے میاں نے پوچھا:

"سیٹھ صاحب! یہ جاپان کیوں جنگ میں کود پڑا ہے۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔"

مشتاق سیٹھ نے شاید اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"بڑے میاں یہ بچوں کے کھلونوں والے ملک جاپان کی انگریزوں کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ اور پھر اب تو امریکہ بھی انگریزوں کے ساتھ ہے۔ تم دیکھ لینا انگریز جاپانیوں کا کچومر نکال دیں گے۔"

دکان کے ایک سورتی ملازم نے کہا:

"سیٹھ جی! آج صبح ایک برمی' ہوٹل میں کہہ رہا تھا کہ اب انگریزوں کو یہاں سے بوریا بستر گول کرنا پڑے گا۔ بہت جلد برما آزاد ہو جائے گا۔"

مشتاق سیٹھ نے برمیوں کو گالی دے کر کہا: "ان برمی بھنگوں کا باپ انگریزوں کا مقابلہ کرے گا؟"

سورت کے رہنے والے دبلے پتلے ملازم نے کہا: "سیٹھ جی! وہ برمی کہہ رہا تھا کہ ہم جاپانیوں سے مل کر انگریزوں کو یہاں سے نکالیں گے۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اب تم لوگ بھی یہاں نہیں رہو گے۔ تمہاری دکانوں پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا۔"

"ان کا باپ بھی ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔"

یہ کہتا ہوا مشتاق سیٹھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ملٹری سپلائی سے جو اندھی دولت اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو رہی تھی' اس نے سیٹھ مشتاق کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اب اسے نہ اپنی دکان کا خیال تھا' نہ اپنی بیوی زاہدہ کی عافیت کا خیال تھا۔ اگر خیال تھا تو صرف یہ کہ جہازوں میں اسکا مال بھر بھر کر یورپ پہنچتا رہے اور اسے دولت ملتی رہے۔ مشتاق سیٹھ کے بینک بیلنس میں روز بروز لاکھوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے پرانی گاڑی اپنے کسی دوست کو دے دی اور نئی گاڑی خرید لی۔ اب وہ نئی گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے دکان پر آتا تھا۔

دوسری طرف حالات روز بروز تشویش ناک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جاپان کے اعلان جنگ کے فوراً بعد رنگون شہر میں رات کو بلیک آؤٹ ہونے لگا تھا۔ رات کو بازاروں اور عمارتوں میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ رنگون شہر کی جگمگاتی رونقیں اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔ دن کے وقت شہر کے بازاروں میں فوجی ٹرک گذرتے دکھائی دینے لگے۔ مجھے زاہدہ کی فکر لگ گئی کہ ان حالات میں وہ ضرور گھر میں اکیلی گھبرا رہی ہوگی۔ مگر میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ زاہدہ نے مجھے گھر آنے سے منع کر دیا ہوا تھا۔ رنگون ریڈیو پر جو خبریں نشر ہوتیں' ان میں انگریزوں کی فوجی تیاریوں اور برما کے دفاع کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کی جاتی تھیں۔ لیکن برمی قوم پرست اخباروں نے انگریزوں پر تنقید شروع کر دی تھی۔ یہ تنقید میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن دکان پر باتیں ہوتیں تو معلوم ہوتا کہ برما کی قوم پرست سیاسی جماعتیں انگریزوں سے آزادی چاہتی ہیں۔ انگریز حکومت اس وقت اپنی مصیبت

میں الجھی ہوئی تھی۔ پھر بھی برما کے قوم پرست عناصر کو جگہ جگہ گرفتار کیا جارہا تھا۔

رنگون میں سب سے زیادہ پریشان ہندوستانی طبقہ تھا۔ ان میں پنجاب' سرحد' گجرات' مہاراشٹر' حیدر آباد' دکن اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ جو سالہا سال سے رنگون میں رہ رہے تھے اور جن کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ رنگون کی فریزر سٹریٹ میں جہاں اقبال صاحب کا فرنیچر مارٹ تھا' میں ان سے ملنے گیا تو وہ بھی مجھے پریشان دکھائی دیئے۔ اس سے پہلے میں ان سے دو تین بار مل چکا تھا اور میں نے انہیں بتادیا تھا کہ میں مشتاق سیٹھ کی دکان پر ملازمت کرنے لگا ہوں۔

مجھے دیکھتے ہی بولے: "میاں ! تم تو اکیلی جان ہو۔ پہلے جہاز میں بیٹھ کر کلکتے بھاگ جاؤ۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم تو یہاں بیٹھے رہنے پر مجبور ہیں۔"

میں نے کہا: "سیٹھ جی! ہمارے سیٹھ صاحب تو کہتے ہیں کہ انگریزوں نے بہت بڑی فوج یہاں منگوالی ہے۔"

اقبال صاحب نے طنزاً کہا: "میاں کوئی بڑی فوج نہیں آئی' ابھی تک۔ ارے انگریز کہاں سے فوج لائے گا۔ انڈیا میں جو فوجی بھرتی کر رہا ہے' اسکی رجمنٹیں بنا بنا کر افریقہ میں بھیج رہا ہے۔ جنرل رومیل نے تو افریقہ میں انگریزوں کا مار مار کر برا حال کر دیا ہے۔ یہاں فوج کہاں سے لائے گا۔"

میں نے اقبال صاحب سے پوچھا: "آپ کا کیا خیال ہے۔ رنگون بچ جائے گا کہ نہیں؟"

اقبال صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر سگار کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے: "میاں خدا سے دعا مانگو کہ وہ ہمارے گناہ معاف کردے۔ مجھے تو معاملہ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں تو تمہیں یہی کہوں گا کہ اکیلی جان ہو' یہاں سے نکل جاؤ۔"

آج اتنے سالوں بعد مجھے اقبال فرنیچر مارٹ والے اقبال صاحب کی بات یاد آتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ انہوں نے مجھے کتنا صحیح اور بروقت مشورہ دیا تھا۔ مگر ایک تو میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اس عمر میں آدمی ویسے بھی ایڈونچر پسند ہوتا ہے اور دوسروں کی نصیحت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دوسرے رنگون میں میری محبت' میری محبوبہ زاہدہ بھی رہ رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتا تھا۔

رنگون شہر کے کاروباری مراکز بلیک آؤٹ سے پہلے سرِشام ہی بند ہو جاتے تھے۔ لوگ دکانوں کو تالا لگا کر اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ مشتاق سیٹھ بھی سورج غروب ہوتے ہی دکان بند کروادیتا اور اپنی نئی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے بنگلے پر زاہدہ کے پاس چلا جاتا۔ جب راتوں کو بلیک آؤٹ میں برمی لوگوں نے دکانوں کے تالے توڑ کر لوٹ مار کی وارداتیں شروع کردیں تو انگریز حکومت کے حکم سے رات کو بلیک آؤٹ کے ساتھ کرفیو بھی لگادیا گیا۔ شہر میں ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے اعلان کروادیا گیا کہ رات کو بلیک آؤٹ کے دوران کرفیو لگا ہو گا' اگر کوئی شخص چلتا پھرتا نظر آیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

جاپانیوں نے انگریزوں کو رنگون میں کرفیو لگانے اور امن وامان بحال رکھنے کی تکلیف کا زیادہ موقع نہ دیا۔ جاپانیوں کی یلغار ایک طوفان کی

طرح آگے ہی آگے بڑھتی چلی آئی۔ انہوں نے دیکھتے دیکھتے فلپائن 'ملایا' جاوا سماٹرا اور جنوبی سمندروں کے جزیروں پر قبضہ کرلیا۔ شمال کی جانب وہ امپھال کی طرف سے آگے بڑھے۔ جب سنگاپور بھی انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو جاپانی فوجیں انگریزوں کے دفاع کو خس و خاشاک کی طرح اڑاتی برما میں داخل ہوگئیں۔ رنگون شہر میں افراتفری مچ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا کہ ریڈیو جاپان نے اعلان کیا کہ ہم رنگون کے لوگوں کو کرسمس کا خاص تحفہ دینے آرہے ہیں۔ اور پھر ایک روز جبکہ رنگون کا آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ آسمان پر وی (V) کی شکل میں کتنے ہی جاپانی بمبار طیارے نمودار ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی رنگون شہر سائرن کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

میں اس وقت فریزر سٹریٹ میں سے سولی پیگوڈا کی طرف جارہا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کس کام کے لئے وہاں جارہا تھا۔ سائرن کی آواز سن کر میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر بنے ہوئے ایک بنکر میں اتر گیا۔ یہ پناہ گاہیں زمین کے اندر بنائی گئی تھیں تاکہ ہوائی حملہ ہو تو لوگ یہاں چھپ جائیں۔ جاپانی جہازوں کی گونج صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد پہلا دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ اتنا زبردست تھا کہ زمین اوپر کو آکر پھر نیچے چلی گئی۔ پھر دھماکے ہونے لگے۔ جاپانی طیارے رنگون پر بمباری کر رہے تھے۔ فائیٹر طیاروں کے زناٹے گونج رہے تھے۔ ساتھ ہی مشین گنوں کے فائر کی آوازیں بھی آنے لگیں۔

جاپانی طیارے غوطے لگاکر عمارتوں اور بازاروں پر مشین گنوں کی فائرنگ کر رہے تھے۔ رنگون بم کے دھماکوں سے جل رہا تھا۔ یہ جاپانیوں کا رنگون کے شہریوں کے نام کرسمس کا تحفہ تھا۔ جاپانی طیارے بمباری کر کے چلے گئے تو 'سب ٹھیک ہے' کے سائرن بجنے لگے۔ میں بنکر سے باہر نکلا۔ باہر قیامت کا منظر تھا۔ شہر سیاہ دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جاپانیوں نے سب سے پہلے رنگون کی بندر گاہ پر بم گرائے۔ اس وقت وہاں ایک تیل بردار جہاز کھڑا تھا۔ اس پر بم گرا تو اسے آگ لگ گئی۔ یہ اسی تیل بردار جہاز میں لگی ہوئی آگ کا دھواں تھا جو شہر کے اوپر کالی گھٹا بن کر چھا رہا تھا۔ بازار میں ایک ٹرام کار الٹی پڑی تھی۔ سٹریٹ نمبر۹ کے سامنے فریزر سٹریٹ میں ایک سکھ کا ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل کے باہر ایک بہت بڑی چارپائی پر ایک موٹا بوڑھا سکھ بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی چارپائی سے اترتے نہیں دیکھا تھا۔ جاپانی فائیٹر طیاروں نے غوطے لگا لگا کر اس بازار میں گولیاں برسائی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ موٹا بوڑھا سکھ چارپائی پر مردہ پڑا تھا۔ گولیاں اس کے بدن کو چھلنی کرتی گذر گئی تھیں۔ اسکا خون چارپائی کے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ترکی ریستوران تھا۔ میں یہاں کبھی کبھی چائے پیا کرتا تھا۔ اس ہوٹل میں ریکارڈنگ بھی ہوا کرتی تھی اور مجھے یاد ہے ایک قوالی کا ریکارڈ بار بار لگا کرتا تھا۔ اس قوالی کے بول یہ تھے۔۔۔۔

سکھی دی ڈولی میں ہو جا سوار

ترکی ہوٹل پر بم تو نہیں گرا تھا مگر گولیوں کی بوچھاڑوں نے اس کی دکان کے شوکیس تباہ کر دیئے تھے اور شوکیس میں سجی ہوئی رنگ برنگی پیسٹریاں

باہر سڑک پر بکھری پڑی تھیں۔ لوگوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے بھاگتا چلا جارہا تھا۔ میں بھی گھبرایا ہوا تھا اور مشتاق سیٹھ کی دکان کی طرف تیز تیز جارہا تھا۔ چوک میں 'میں نے کئی انسانی لاشیں دیکھیں جو جاپانی طیاروں کی سٹریفنگ کا شکار ہوگئی تھیں۔ کئی بلڈنگوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور فائر بریگیڈ والے اسے بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں میکسم سٹریٹ کے قریب سے گذرا تو وہاں بھی ایک بم گرا تھا۔ میکسم سٹریٹ کے کونے پر ایک بار ہوتی تھی جہاں لوگ مے نوشی کرتے تھے۔ اسی گلی میں رنگون کا ریڈیو سٹیشن تھا۔ جاپانیوں کو ان کے جاسوسوں نے بتادیا تھا کہ یہاں ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہاں دو بم گرے تھے۔ مگر ریڈیو سٹیشن بچ گیا تھا جو گلی کے کونے میں ایک عمارت کی نچلی منزل میں تھا۔ دونوں بم میکسم بار کے عقب کی بلڈنگ پر گرے تھے۔ یہ بلڈنگ پوری طرح تباہ ہوگئی تھی اور اسے آگ لگی ہوئی تھی۔ میکسم بار میں اس وقت بھی کچھ غیر ملکی ملاح بیٹھے بادہ نوشی کر رہے تھے۔

میں مشتاق سیٹھ کی دکان والے بازار میں داخل ہوا تو میرا دل خوف سے سہما ہوا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہاں بھی بم نہ گرے ہوں۔ مگر وہ بازار محفوظ تھا۔ لیکن لوگوں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ دکان کے باہر زاہدہ کے خاوند مشتاق سیٹھ کی نئی ٹرانف گاڑی موجود نہیں تھی۔ میں دوڑ کر دکان میں داخل ہوا تو بڑے میاں کو دیکھا کہ وہ سخت گھبرائے ہوئے تھے اور نوکروں سے سامان اندر رکھوا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو غصے میں بولے:

"تم کہاں مر گئے تھے۔ چلو وہ تھان اٹھا کر ادھر پھینکو۔"

معلوم ہوا کہ مشتاق سیٹھ اپنی بیوی زاہدہ کی خیریت معلوم کرنے مکان پر گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ مشتاق واپس آگیا۔ وہ سہما ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ بڑے میاں نے گھر کی خیریت پوچھی تو سیٹھ وہیں کاؤنٹر پر بیٹھ گیا اور بولا:

"ادھر بم نہیں گرے۔ اللہ نے کرم کیا۔ مجھے پانی پلاؤ۔"

اس پر زبردست خوف اور دہشت کی کیفیت طاری تھی۔ بڑے میاں نے جلدی سے گلاس میں پانی لا کر دیا اور کہا:

"سیٹھ صاحب! میرا خیال ہے آپ بیگم صاحب کو لے کر مانڈلے چلے جائیں۔"

مشتاق سیٹھ نے پانی پیا۔ اور بولا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جاپانی برما میں داخل ہو گئے ہیں۔ سارے راستے بند ہیں۔ ہم یہاں پھنس گئے ہیں بڑے میاں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا سے دعا کرو۔۔۔ بس۔۔۔۔"

مشتاق سیٹھ کی وہی حالت تھی جو اس وقت ایسے سرمایہ دار تاجر کی ہونی چاہئے تھی جس کے لاکھوں روپے بلکہ کروڑوں روپے رنگون کے بینکوں میں جمع ہوں اور اسے ساری دولت ڈوبتی نظر آ رہی ہو۔ مگر آدمی کاروباری تھا۔ لاکھوں کا سامان دکان میں پڑا تھا۔ جلدی سے اٹھا اور بڑے میاں سے کہا:

"جتنا قیمتی مال ہے' میری گاڑی میں بھر دو۔"

پھر میری طرف دیکھ کر بولا: "تم ڈرائیور کے ساتھ جاؤ اور سارا مال لے جا کر گودام میں بند کراؤ۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور خدا جانے کہاں کہاں فون کرنے شروع کر دیئے۔ مگر جاپانیوں نے رنگون پر یونہی بمباری نہیں کی تھی۔ ان کی

فوجیں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے جنگی جہاز خلیج مرتبان میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ طیارہ بردار جہاز تھے۔ ان بحری جنگی جہازوں سے اڑ کر وہ رنگون پر بمباری کر رہے تھے۔ مشتاق سیٹھ کا گودام رنگون کی مشہور سکاٹ مارکیٹ میں تھا۔ میں قیمتی کپڑوں کے تھان کا پہلا پھیرا لے کر ہی گیا تھا کہ ایک بار پھر رنگون ہوائی حملے کے سائرنوں سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی جاپانی بمبار جہاز آسمان پر نمودار ہوئے اور انہوں نے شہر پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ سکاٹ مارکیٹ میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ لوگ دکانیں چھوڑ کر جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ جو بازار میں نکل آئے' انہیں جاپانی فائیٹر طیاروں کی مشین گنوں نے بھون ڈالا۔ میں اس وقت سکاٹ مارکیٹ کے آگے مشتاق سیٹھ کی گاڑی کے پاس کھڑا کپڑوں کے باقی بچے ہوئے تھان اتروا رہا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ میں دوڑ کر ایک درخت کے پیچھے گیا۔ جاپان کے فائیٹر طیارے نیچی اڑان کے ساتھ غوطے لگا لگا کر بازار میں گولیاں برسا رہے تھے۔ فلیٹوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ گولیوں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ بازار میں دیکھتے ہی دیکھتے انسانی لاشیں تڑپنے لگیں۔ جو زخمی تھے' وہ خون گراتے لنگڑاتے ہوئے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ میں خود گھبرا گیا تھا۔ شہر بم کے دھماکوں سے لرز رہا تھا۔ خدا خدا کر کے جاپانی طیارے واپس چلے گئے۔

میں گاڑی کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور ابھی تک خوف کے عالم میں گاڑی کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے باہر نکالا اور کہا: "جلدی سے دکان پر چلو۔"

سکاٹ مارکیٹ میں قیامت کا عالم تھا۔ سڑک پر جگہ جگہ لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ ڈرائیور ان لاشوں کے اوپر سے گاڑی نکالتا ہوا لے گیا۔ جس بازار میں ہمارے ہوٹل تھا' اس بازار کی تین چار بلڈنگوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے دکان پر پہنچے۔ مشتاق سیٹھ دہشت زدہ ہو کر دکان بند کئے اندر بڑے میاں کے پاس بیٹھا تھا۔ گاڑی کی آواز سن کر دکان کا دروازہ کھول دیا گیا۔ میں بھی دوسرے ملازموں کے پاس خوف زدہ ہو کر بیٹھ گیا۔ مشتاق سیٹھ جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گیا اور ڈرائیور سے کہا:

"گھر چلو۔ جلدی۔"

وہ یہ دیکھنے گھر جا رہا تھا کہ اس کا مکان سلامت ہے کہ نہیں۔ کیونکہ دوسری بمباری بڑی شدید تھی۔ اس بمباری سے رنگون کا کوئی علاقہ نہیں بچا تھا۔ جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ میں دکان میں ہی بیٹھا رہا۔ بڑے میاں دکان کے ادھ کھلے دروازے میں کھڑے باہر بازار میں دیکھ رہے تھے۔ پھر گھبرا کر انہوں نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی اور بولے: "برمی جلوس آرہا ہے۔"

یہ جلوس نہیں تھا بلکہ برمی لوگ ٹولیوں کی شکل میں ہندوستانیوں کی دکانوں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ ہماری دکان پر بھی باہر سے لوہے کی سلاخیں اور ہتھوڑے زور زور سے مارے گئے۔ مگر دروازہ مضبوط تھا۔ ٹوٹ نہ سکا۔ لوٹ مار کرنے والوں کی ٹولی انگریزوں' ہندوستانیوں اور خاص طور پر پنجابیوں کے خلاف نعرے لگاتی آگے نکل گئی۔ بڑے میاں سر پکڑ کر کاؤنٹر سے

ٹیک لگا کر بولے: "انگریزوں کی فوج کہاں مرگئی ہے؟ انگریز ہمیں جاپانیوں اور برمیوں کے حوالے کر کے بھاگ گئے ہیں۔"

پھر دعا کے لئے ہاتھ پھیلا کر بولے: "یا اللہ! ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا"

بڑے میاں نے کہیں فون کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ ٹیلی فون کا نظام ختم ہو گیا ہے۔ مشتاق سیٹھ کو گئے آدھا گھنٹہ گذر گیا تھا۔ میں زاہدہ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ مگر میں کسی سے اس بارے میں بات کرنے سے گریزاں تھا۔ بڑے میاں نے سورتی ملازم سے کہا:

"تم گھر جا کر خیریت معلوم کر کے آؤ۔ خدا خیر کرے۔ سیٹھ صاحب کی بیگم صاحب اکیلی تھیں۔۔ میرے خدایا۔۔۔!"

سورتی ملازم تیزی سے دکان سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس کے بعد میں آج تک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تھوڑی دیر بعد آسمان پر جاپانی بمبار جہازوں کی ایک نئی ٹولی نمودار ہوئی اور رنگون پر ایک بار پھر بموں کی قیامت برسنے لگی اور گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ اس دفعہ ہمارے بازار کی باری ہے۔ دھماکے قریب سے سنائی دینے لگے۔ سارا بازار اس طرح ہلنے لگا جیسے زلزلہ آرہا ہو۔ بڑے میاں گھبرا کر پچھلے کمرے کی طرف بھاگے۔ دوسرے ملازمین دوڑ کر دکان سے باہر نکل گئے۔ ایک بم بازار میں ہماری دکان سے کچھ فاصلے پر گرا۔ دھماکے نے میرے کان بند کر دیئے اور میں سٹول پر بیٹھے بیٹھے اچھل کر آگے گر پڑا۔

مجھے موت سامنے نظر آنے لگی۔ بازار میں جاپانی طیارے گولیاں برسا رہے تھے۔ میں دوڑ کر راہ داری میں سے ہوتا ہوا پچھلی کوٹھڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں دکان کی پرانی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ جہازوں کے

زناٹوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ یہ فائیٹر طیارے تھے جو بازار کی عمارتوں پر نیچی پرواز کر کے سٹریفنگ کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے کیا تھے گویا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑے تھے۔ میں جہاں بیٹھا تھا' وہاں سے زمین نے مجھے تین چار فٹ اوپر اچھال دیا۔ میں لکڑی کے خالی کھوکھوں پر گرا اور میری چیخ نکل گئی۔ مجھ پر مٹی گری۔ یہ کوٹھڑی کی چھت میں سے گری تھی۔ کوٹھڑی میں جو بتی جل رہی تھی' بجھ گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں خوف کے مارے کانپ رہا تھا اور خدا سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس رکھی تھیں کہ اگر دوسرا دھماکہ ہو تو میرے کانوں کے پردے محفوظ رہیں۔ مگر پھر کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ میں اٹھا کہ کوٹھڑی سے باہر نکلوں۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل نہیں رہا تھا۔ حالانکہ میں نے اندر سے چٹخنی بالکل نہیں لگائی تھی۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر دروازے کو باہر راہ داری کی طرف دھکیلا۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھل گیا مگر ساتھ ہی باہر کسی چیز کے فرش پر گرنے کی تیز آواز آئی۔ دروازے میں سے دن کی ہلکی روشنی اندر آئی تو میں نے آنکھ دروازے کے ساتھ لگا کر باہر دیکھا۔ باہر راہ داری میں دکان کی ایک دیوار کا ملبہ پڑا ہوا تھا۔ ایک شہتیر میری کوٹھڑی کے دروازے پر آکر لگ گیا تھا۔ جب میں نے زور لگایا تو وہ شہتیر تیز آواز کے ساتھ ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ ملبے میں دو تین فٹ تک دھنس چکا تھا۔ مجھے باہر ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آرہا تھا۔ دور سے لوگوں کی چیخوں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ میرے اندر خدا جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ میں نے ادھ کھلے پٹ کو زور

سے باہر دھکیلا تو وہ اتنا کھل گیا کہ میں اس میں سے نکل سکتا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ راہ داری میں کئی فٹ اونچا ملبے کا ڈھیر لگا تھا۔ سامنے والی دکان کی دیوار گر چکی تھی اور اندر ٹوٹی ہوئی چھت کے شہتیروں میں سے مشتاق سیٹھ کی دکان کے کچھ تھان' خانوں میں لگے نظر آ رہے تھے۔ ایک بم ساتھ والی بلڈنگ پر گرا تھا۔

راہ داری میں باہر سے دھواں اندر آ رہا تھا۔

میں دوڑ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سیٹھ مشتاق کی دکان کا اگلا حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ساتھ والی بلڈنگ آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہاں کوئی آگ بجھانے والا انجن نہیں تھا۔ خدا جانے دکان کے ملازم اور بڑے میاں کا کیا حشر ہوا ہو گا۔ بازار میں دوسری تین چار بلڈنگوں کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ کئی ڈھے کر بازار میں ملبے کا ڈھیر بن گئی تھیں اور جو باقی بچی تھیں، ان میں سے آگ اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔

ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ سامنے والی عمارتوں اور دکانوں کو بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ درخت جڑ سے اکھڑ کر گرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ ریستوران کے سامنے جو درخت تھا۔ اس درخت کی شاخوں میں کسی بدنصیب کی صرف دو ٹانگیں لٹکتی رہ گئی تھیں۔

یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ ایک لمحے کے لئے میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ بلڈنگوں کے ملبے، آگ اور دھوئیں سے اپنے آپ کو بچاتا بازار کے دوسرے کونے پر آ گیا۔ وہاں آگ بجھانے والا صرف ایک انجن آگ بجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس بازار میں بھی افراتفری کا عالم تھا۔

سب دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ برمی نوجوانوں کا ایک جلوس نعرے لگاتا ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہاکیاں پکڑے دوڑتا ہوا گذر گیا۔ یہ لوگ پنجابیوں کی بچی کھچی دکانوں کو لوٹ رہے تھے۔

میں وہیں ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔

مجھے سیٹھ مشتاق اور زاہدہ کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگی' زندہ بھی بچی ہوگی یا نہیں۔ اچانک خیال آیا کہ جہاں اس کا بنگلہ ہے' اس کے پیچھے فوجی بارکیں ہیں۔ جاپانیوں نے وہاں ضرور بمباری کی ہوگی۔ کیونکہ رنگون میں ہر کسی کی زبان پر یہی ایک بات تھی کہ برمی لوگوں نے جاپانیوں کے لئے زبردست جاسوسی کی ہے اور انہیں رنگون کے بارے میں پہلے سے سب کچھ بتا دیا تھا کہ ریڈیو سٹیشن کہاں ہے؟' گولہ بارود کے ڈمپ انگریزوں نے کہاں بنائے ہوئے ہیں؟۔ اس خیال سے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں اٹھا اور سولی پیگوڈا چوک کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ اس وقت دن غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بمباری کی وجہ سے جلتی ہوئی عمارتوں کے دھوئیں نے سورج غروب ہونے سے پہلے شہر میں شام کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دکانیں لٹی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں پنجابی' گجراتی' تامل' ہندوستانی مہاراشٹر اور سورتی میمن لوگ بھی تھے۔ ایک بھی برمی نہیں تھا۔ سولی پیگوڈا پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

اس بدھ مندر کی سیڑھیوں پر برمی عورتیں پھول بیچا کرتی تھیں۔ سیڑھیاں خالی پڑی تھیں۔ ان عورتوں میں سے ایک بھی عورت وہاں نہیں تھی۔ بازار خالی اور سنسان پڑے تھے۔ ایک فوجی ٹرک تیزی سے گذر گیا۔

کچھ ہندوستانی لوگوں نے اس ٹرک کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ دو ایک ہندوستانی نوجوانوں نے ٹرک میں بیٹھے گورے فوجیوں کو گالیاں بھی سنا دیں۔ فلیٹوں کے دروازے کھلے تھے۔ یہاں بھی بم گرے تھے۔ سڑک پر ان بموں کے گرنے سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ کئی جگہ گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ زاہدہ کے گھر کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں گری ہوئی عمارتوں کے ملبوں کے اوپر سے یا پہلو سے ہوتا ہوا سولی پیگوڈا کی عقبی گراؤنڈ والی سڑک پر آ گیا۔ یہاں آتے ہی میری نگاہیں اپنے آپ زاہدہ کے بنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس طرف سے کالے سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

یہ دھواں کیولری گراؤنڈ والی گورا فوج کی بارکوں میں سے اٹھ رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ جاپانیوں نے ان بارکوں پر اندھا دھند بم برسائے تھے۔ میں اس طرف جانے کے لئے آگے بڑھا تو کچھ لوگ جو وہاں کھڑے بارکوں میں اٹھتے دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس طرف جانے سے روکا۔ مگر میں نے ان کی پروا نہ کی اور سامنے والی گراؤنڈ میں داخل ہو گیا۔ یہاں تک آتے آتے شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ کسی سڑک پر کوئی بجلی کا کھمبا روشن نہیں تھا۔ شہر کی طرف جلتی ہوئی عمارتوں کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ میں ابھی گراؤنڈ میں سے گذر ہی رہا تھا کہ آسمان پر طیاروں کی گھن گرج سنائی دی۔ اس بار کوئی سائرن نہیں بجا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ انگریزوں کے طیارے ہوں گے۔ مگر انگریزوں کے طیارے وہاں کہیں بھی کسی بھی وقت آسمان پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں چھپوں کہ دو طیارے گرجتے غراتے میرے اوپر سے گذر گئے۔ ان کا

رخ گوروں کی بارکوں کی طرف تھا۔ وہ میرے دیکھتے دیکھتے بارکوں کے اوپر جو دھوئیں کے بادل تھے' اس میں غائب ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے بموں کے چار دھماکے بلند ہوئے۔ میرے خدا ۔۔۔ یہ دھماکے اتنے زبردست تھے کہ میری آنکھوں کے آگے بجلی کوند گئی ۔۔ میرے کان سن ہوگئے ۔۔۔ میں منہ کے بل گھاس پر گر پڑا۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اچانک مزید دو جاپانی طیارے میرے اوپر سے گرجتے ہوئے گذرے۔ دوسرے لمحے ایک بار پھر چار دھماکے ہوئے۔ میں نے آنکھیں بند کرکے اپنا چہرہ زمین کے ساتھ لگادیا۔ ان دھماکوں نے مجھے زمین سے اوپر اچھال کر پھر زمین پر گرادیا تھا۔ یا اللہ خیر! 'یا اللہ خیر!' میری زبان سے یہ دعا جاری ہوگئی۔ اس طرف زاہدہ کا بنگلہ تھا۔ بم بنگلے کے عقب میں ہی گر رہے تھے۔ یا اللہ زاہدہ کو زندہ بچالینا۔ میں دیوانوں کی طرح' بلکہ بچوں کی طرح اونچی اونچی آواز میں دعائیں مانگ رہا تھا اور زمین پر منہ کے بل لیٹا خوف اور دہشت سے کانپ رہا تھا۔

اس کے بعد جب کوئی دھماکہ نہ ہوا تو میں حوصلہ کرکے اٹھا۔ انگریزوں کی بارکوں والی کیولری گراؤنڈ کی طرف دیکھا۔ میرے خدا! اس جانب سوائے شعلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں دیوانہ وار زاہدہ کے بنگلے کی طرف دوڑنے لگا۔ گراؤنڈ کے آخر میں پہنچ کر دیکھا کہ کیولری گراؤنڈ والی گوروں کی بارکوں میں ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ زاہدہ کے بنگلے کے ساتھ ساتھ جتنے بنگلے تھے' ان کی جگہ ان کے ملبے پڑے تھے۔ یہ لکڑی اور بانس کے بنگلے تھے۔ بم ان کے اوپر نہیں گرے تھے مگر بموں کے دھماکوں نے ان کے پرخچے اڑادیئے تھے۔

زاہدہ کے بنگلے کا صرف اگلا حصہ ہی بچا ہوا تھا۔

میں نے دوڑ کر سڑک پار کی اور زاہدہ کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک جانب زاہدہ کے خاوند سیٹھ مشتاق کی نئی ٹرانف موٹر کار اس حالت میں کھڑی تھی کہ اسکا آدھا حصہ پچک گیا تھا اور آدھے حصے پر مکانوں کا ملبہ پڑا تھا۔ بنگلے کا دروازہ اکھڑ کر دور جا پڑا تھا۔ بر آمدے میں بھی ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ میں نے بند دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں بد حواس ہو کر پہلو والی تنگ راستے سے دوڑتا ہوا بنگلے کے عقبی لان میں آگیا۔ یہاں سوائے ملبے کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر گوروں کی بارکیں دھڑا دھڑ آگ میں جل رہی تھیں۔ جیسے وہاں آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ لکڑیوں کے جلنے اور ان کے گرنے سے خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ اچانک ایک اور دھماکہ ہوا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ پھر دھماکے شروع ہو گئے۔ میں سمجھا جاپانی بمبار پھر آ گئے ہیں۔ مگر طیاروں کی آواز نہیں آئی تھی۔ یہ بارکوں کے پیچھے گولہ بارود کے بچے کھچے ڈمپ پھٹ رہے تھے۔ میں دھماکوں کے شور میں ہی زاہدہ کی تلاش میں بنگلے کے اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ مجھے ایک چھوٹا دروازہ مل گیا۔ یہ دروازہ کھلا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر اندر چلا گیا۔

سامنے بیڈ روم تھا جس کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ میں قریب گیا تو مجھے اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں بے دھڑک بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی بیڈ روم تھا جہاں زاہدہ کے پاس بیٹھ کر میں نے باتیں کی تھیں اور زاہدہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اب میں اس کے گھر میں

کبھی نہیں آؤں گا۔ بیڈ روم میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے زاہدہ کی آواز پہچان لی۔ یہ زاہدہ رو رہی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں کہا:

"زاہدہ' میں ہوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟"

زاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ میں اس کی آواز کا اندازہ لگا کر اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ اب مجھے اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا دکھائی دینے لگا تھا۔

"زاہدہ! سیٹھ صاحب کہاں ہیں؟"

زاہدہ کی چیخ نکل گئی۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "مشتاق مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلا گیا۔"

اور وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے حوصلہ دینے لگا۔ اب میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھا۔ بیڈ پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"یہاں سے نکل چلو۔ بارکوں کی آگ یہاں تک پہنچ رہی ہے۔ جاپانی طیارے دوبارہ بمباری کرنے آسکتے ہیں۔"

زاہدہ نے روتے روتے کہا: "میں مشتاق کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی' میں نہیں جاؤں گی۔ میں اس کے ساتھ مروں گی۔۔۔۔۔۔۔ تم یہاں سے چلے جاؤ' تم یہاں کیوں آگئے ہو۔۔۔۔"

میں نے جیب میں سے ماچس نکال کر جلائی۔ اس کی روشنی میں' میں نے دیکھا کہ بستر پر سفید چادر میں لپٹی سیٹھ مشتاق کی لاش پڑی تھی۔ چادر پر جگہ جگہ خون کے سرخ دھبے پڑے تھے۔ زاہدہ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

وہ قالین پر پلنگ کی پٹی پر سر رکھے رو رہی تھی۔ تیلی بجھنے لگی تو میں نے دوسری تیلی روشن کرلی اور زاہدہ سے کہا:

"زاہدہ خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔ جاپانی طیارے بمباری کرنے نہ آئے تو برمی غنڈے یہاں آجائیں گے۔ ہوسکتا ہے جاپانی فوجی بھی ان کے ساتھ ہوں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ جاپانی فوج رنگون میں داخل ہوگئی ہے۔"

زاہدہ نے پلنگ کی پٹی پر سے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد رونے سے اور غم کے باعث سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ چہرہ اتر کر کمزور ہو گیا تھا۔ کہنے لگی:

"میں مشتاق کی لاش یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ مجھے مرنے کے لئے یہاں رہنے دو۔"

میں نے جلتی ہوئی ماچس کی روشنی میں کارنس پر پڑی ہوئی بڑی سفید موم بتی دیکھ لی تھی جو ایک چینی کے پیالے میں لگی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر کارنس تک گیا اور موم بتی جلادی۔ بیڈ روم میں موم بتی کی دھیمی دھیمی روشنی ہوگئی۔ میں زاہدہ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور مشتاق سیٹھ کی لاش کو دیکھنے لگا۔ میں نے لاش کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا تو میرا جسم دہشت سے سرد پڑ گیا۔ سیٹھ مشتاق کی کھوپڑی ایک طرف سے اڑ گئی تھی اور اندر سفید مغز صاف نظر آرہا تھا۔ چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اسکا چہرہ ڈھانپ دیا۔

"یہ سب کیسے ہو گیا زاہدہ؟"

زاہدہ نے سسکیوں کے درمیان جو واقعات مجھے سنائے' وہ یہ تھے کہ مشتاق سیٹھ جب زاہدہ کا حال معلوم کرنے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کے ساتھ بنگلے پر آیا تو اس وقت بمباری نہیں ہو رہی تھی۔ بنگلہ ٹھیک حالت میں تھا۔ زاہدہ بھی زندہ سلامت تھی۔ سیٹھ نے زاہدہ سے کہا کہ ہم تھوڑی دیر میں مانڈلے جا رہے ہیں۔ یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ زاہدہ نے بتایا کہ میں ضروری سامان وغیرہ باندھنے لگی۔ مشتاق نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی باہر ہی چھوڑ دے اور خود بھٹی صاحب کے ہاں جائے اور انہیں یہاں بلا لائے۔ بھٹی صاحب سے مشتاق سیٹھ کے دوستانہ مراسم تھے۔ اسکا خیال تھا کہ وہ بھٹی صاحب کی فیملی کو بھی ساتھ لے کر مانڈلے جائے گا۔ ڈرائیور نے آکر بتایا کہ بھٹی صاحب کا بنگلہ خالی پڑا ہے۔ اسی دوران جاپانی طیارے تیسری بار بمباری کرنے رنگون میں داخل ہو گئے۔ ان ان کا نشانہ بنگلے کے پیچھے کیولری گراؤنڈ میں گورا فوج کی بارکیں تھیں۔ طیاروں نے فوجی بارکوں پر اندھادھند بمباری شروع کر دی۔ زاہدہ نے کہا کہ اس وقت وہ بنگلے کے عقبی لان میں بیٹھے وہاں سے اکیلے ہی مانڈلے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ڈرائیور بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ جب گورا فوج کی بارکوں پر بم گرنے لگے اور دھماکے ہوئے تو وہ تینوں لان میں سے اٹھ کر اندر کو دوڑے۔ خدا جانے کہاں سے لوہے کا ایک ٹکڑا اڑا ہوا آیا اور مشتاق سیٹھ کے سر کی بائیں جانب لگا۔ یہ بم کا ٹکڑا تھا۔ مشتاق وہیں گر پڑا۔ اس کی کھوپڑی ایک طرف سے اڑ گئی تھی اور بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ زاہدہ چیخ مار کر وہیں گر پڑی۔ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے سیٹھ کی لاش کو اٹھایا اور اندر بیڈ روم میں لاکر بستر پر ڈال دیا۔ زاہدہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس نے ڈرائیور کو نہیں دیکھا۔ ڈرائیور وہاں سے جان بچا کر

بھاگ گیا تھا۔ زاہدہ بھی روتی پیٹتی بیڈ روم میں اپنے خاوند کی لاش کے پاس آگئی۔ اس کے بعد وہ اپنے خاوند کی لاش کے پاس ہی بیٹھی روتی رہی۔ جب میں بیڈ روم میں آیا تو وہ وہیں بیٹھی رو رہی تھی۔

میں نے زاہدہ کو کافی سمجھانے کی کوشش کی کہ شہر پر خدا کا عذاب نازل ہوا ہے۔ گلیوں' بازاروں میں انسانوں کی لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اور میں نہ جانے کس طرح زندہ بچ کر اسکی خیریت معلوم کرنے وہاں پہنچ گیا ہوں مگر زاہدہ کی سسکیاں نہیں تھم رہی تھیں۔ وہ واقعی ایک ستی ساوتری وفا شعار بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اس کے آنسو نقلی آنسو نہیں تھے۔ میں اسے وہاں چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے وہاں سے نکال کر کہاں لے جاؤں گا۔ شہر میں تو ہر فیملی اس مصیبت میں گرفتار تھی۔ ہر گھر میں ماتم بپا تھا۔ لوگوں کے گھر تباہ ہو گئے تھے۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو گا جس کا کوئی مرد بمباری میں نہ مرا ہو۔ بیڈ روم کی موم بتی ماتمی روشنی پھیلائے آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ بارکوں کے دھماکے ختم ہو گئے تھے۔ بھڑکتی ہوئی آگ کی کڑکڑاہٹیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہر طرف موت کی خاموشی چھا گئی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی دور کسی ٹرک یا گاڑی کے تیزی سے گذرنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

کتنی دیر تک زاہدہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتی رہی۔ میں اس کے پاس قالین پر خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ زاہدہ کے دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا ہے تو میں نے آہستہ سے کہا:

"قدرت کو یہی منظور تھا زاہدہ۔ اب تمہیں حوصلہ کرنا چاہئے۔"

اچانک باہر مشین گن چلنے کی تڑ تڑ آواز آئی۔ زاہدہ ڈر گئی: "جاپانی تو نہیں آ گئے؟"

گولیوں کی تڑ تڑاہٹ فضا میں گونج کر آگے نکل گئی تھی۔ میں نے کہا: "تم یہیں بیٹھو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ یہاں سے بالکل نہ ہلنا۔"

میں جس طرف سے اندر آیا تھا اسی طرف سے ملبے کے ڈھیروں پر سے گذرتا ہوا بنگلے کے سامنے والی سڑک پر آیا۔ سڑک سنسان تھی۔ کہیں کوئی سٹریٹ لیمپ نہیں روشن تھا۔ بارکوں کی آگ اب مدھم پڑ گئی تھی۔ فضا میں بارود اور جلی ہوئی لکڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے واپس جاکر زاہدہ کو بتایا کہ باہر کچھ نہیں ہے۔ شاید کوئی فوجی ٹرک لوٹ مار کرنے والوں کے پیچھے مشین گن فائر کرتا گذر گیا ہے۔

میں جلدی سے کچن میں آیا۔ وہاں کھانے پینے کا سامان محفوظ پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا زاہدہ نے کچھ نہیں کھایا پیا ہو گا۔ جلدی جلدی چار پانچ ڈبل روٹی کے ٹکڑے نکال کر آگ پر سینکے۔ دو انڈوں کا آملیٹ بنایا اور زاہدہ کے پاس لے آیا۔

"تم کچھ کھالو زاہدہ۔"

زاہدہ نے میرا ٹرے والا ہاتھ پیچھے کر دیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم کیوں یہ بنا لائے ہو۔"

اور ایک ہچکی بھر کر اس نے اپنا سر خاوند کے پلنگ کی پٹی سے لگا دیا۔ میں نے ڈبل روٹی والا ٹرے وہیں رکھا اور ایک بار پھر کچن میں جاکر کافی کے دو کپ بنا کر لے آیا۔ بڑی مشکل سے میں نے زبردستی زاہدہ کو تھوڑا بہت کھلایا۔ اب وہ مجھ سے قدرے نارمل حالت میں آکر تھوڑی تھوڑی باتیں

کرنے لگی۔ اس نے پوچھا: "رنگون پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تو ہم کہاں جائیں گے؟"

میں نے کہا: "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے انگریزوں کی فوجیں جاپانیوں کو رنگون پر قبضہ نہیں کرنے دیں گی۔ مگر حالات ایسے نہیں لگ رہے ۔ برما کے باشندے بھی ہم ہندوستانیوں کے دشمن ہو گئے ہیں۔ انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ یہاں سے نکل جائیں۔"

زاہدہ پھر رونے لگی۔ میں نے فوراً گفتگو کا موضوع تھوڑا بدلا اور اس سے پوچھا:

"ظاہر ہے اب ہم اس گھر میں نہیں رہ سکیں گے۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کچھ دنوں کے لئے رہ سکو۔ ہو سکتا ہے حالات بہتر ہو جائیں۔ پھر ہم سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ کیونکہ اب تو جنگ چھڑ چکی ہے۔ کوئی سمندری جہاز بھی کلکتے نہیں جائے گا۔"

زاہدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "مسز جمیل کی فیملی ہے۔ ان سے ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ہمارا ان کے ساتھ آنا جانا تھا۔"

"یہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

زاہدہ نے کہا: "یہ فیملی یہاں سے تھوڑی دور کمائیٹ میں رہتی ہے۔ مسز جمیل کے خاوند کا وہاں پھلوں کا روبار ہے۔"

میں نے زاہدہ کو مشورہ دیا کہ ہمیں صبح ہوتے ہی ان کے پاس چلے جانا چاہئے۔ زاہدہ نے پوچھا:

"کیا معلوم وہ لوگ بھی وہاں نہ ہوں۔"

میں نے کہا: "یہ تو وہاں چل کر ہی معلوم ہو گا۔ ہم یہاں بھی نہیں رہ سکتے زاہدہ۔۔۔ کچھ پتہ نہیں صبح اس مکان پر بھی لوٹ مار کرنے والے پہنچ جائیں۔ تم ایسا کرو کہ اگر تمہارے پاس کوئی نقدی زیور ہے تو اسے تھیلے میں ڈال کر اپنے پاس رکھ لو۔ اور کوئی شے ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔"

زاہدہ کہنے لگی: "میرے پاس صرف گلے کا سونے کا لاکٹ' دو سونے کی چوڑیاں اور کانٹے ہی ہیں۔ باقی سارا زیور مشتاق نے بینک کے لاکر میں رکھوا دیا تھا۔"

"اور نقد رقم کتنی ہے؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ نقد رقم کی اب ہمیں قدم قدم پر ضرورت پڑ سکتی ہے۔ زاہدہ نے بتایا کہ نقد رقم چار پانچ ہزار کے قریب ہی ہوگی۔ میں نے کہا:

"یہ رقم اور سونے کے تھوڑے بہت جو زیور ہیں انہیں ایک تھیلی میں ڈال کر باندھ لو۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم صبح ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل کر کمائیٹ مسز جمیل کے ہاں چلے جائیں۔"

زاہدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "میں مشتاق کی میت کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

میں نے کہا: "اس وقت ہم میت کو یہاں کہیں دفن بھی نہیں کرسکتے۔ میت کو ساتھ بھی نہیں لے جاسکتے۔ ایسا کرتے ہیں۔ ہم میت کو امانت کے طور پر یہاں رکھ جاتے ہیں' دو ایک روز میں حالات بہتر ہوئے تو اسے یہاں سے کمائیٹ لے جاکر دفن کردیں گے۔"

زاہدہ پہلے تو اس تجویز پر راضی نہ ہوئی۔ جب میں نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا تو وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر بیڈ روم کے ساتھ ہی چھوٹے سے کمرے میں گئی۔

وہاں سے سونے کا لاکٹ، کانٹے اور چوڑیاں اور نقد رقم الماری میں سے نکال کر لے آئی۔ تھیلی کہیں نہ ملی تو میں نے یہ ساری چیزیں رومال میں لپیٹ کر اچھی طرح سے باندھیں اور زاہدہ سے کہا کہ وہ اسے اپنی کمر کے ساتھ دوپٹے سے کس کر باندھ لے۔ ضرورت کے لئے ہم نے چھ سات سو روپے کی نقدی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ زاہدہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ چھوٹے کمرے میں گئی اور زیور اور نقدی والا رومال اپنی کمر کے گرد باندھ کر آ گئی۔

اس وقت رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔

میں نے زاہدہ سے کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کرنے کی کوشش کرے۔ زاہدہ پلنگ سے ہلنے کو تیار نہ تھی۔ کہنے لگی: "میں یہیں بیٹھی ہوں۔ تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔"

نیند مجھے کہاں آ رہی تھی۔ اگرچہ باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی مگر خطرہ تھا کہ کسی بھی وقت جاپانی بمبار آ کر بمباری کر سکتے ہیں۔ باقی رات ہم نے وہیں گذار دی۔ جب ذرا پو پھٹی تو میں نے زاہدہ سے کہا:

"تم یہاں بیٹھو، میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہمیں کوئی ٹیکسی وغیرہ کہیں سے مل جائے۔"

میں بنگلے کے عقبی لان میں آیا تو دیکھا کہ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بادلوں میں صبح کی سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ میں سامنے والی گراؤنڈ کی سڑک پر آ گیا۔ کیولری گراؤنڈ والی بارکوں کی آگ بجھ چکی تھی۔ اب وہاں صرف ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ سڑک پر جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے تھے۔ میں سولی پیگوڈا کی طرف تیز تیز چل پڑا۔ چوک میں گیا تو

دو فوجی ٹرک تیزی سے گذر گئے۔ چوک خالی پڑا تھا۔ میں چوک کراس کر کے سولی پیگوڈا والی سڑک پر آیا تو دیکھا کہ لوگ مکانوں اور فلیٹوں سے نکل کر چھکڑوں، ٹیکسیوں اور اپنی گاڑیوں پر تھوڑا بہت سامان لاد کر بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا:

"بھائی صاحب، کیا یہاں کوئی ٹیکسی مل جائے گی؟"

یہ آدمی شکل و صورت سے مجھے ہندوستان کا رہنے والا لگا تھا۔ اس نے اردو میں کہا: "یہ ٹیکسی تو ہم نے لے رکھی ہے، کوئی دوسری ٹیکسی تلاش کرو۔"

اس آدمی کے بال بچے ٹیکسی میں سوار ہو چکے تھے۔ اس کے بعد وہ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی آگے چل دی۔ میں پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑا ادھر ادھر تکنے لگا۔ صبح کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔ سولی پیگوڈا کی سیڑھیاں ویران تھیں۔ وہاں کوئی بھکشو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ایک ٹیکسی ساتھ والی سٹریٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ وہ خالی تھی۔ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی کے آگے کھڑا ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور برمی تھا۔ بولا: "کاہے کو مرنا مانگتا ہے۔"

میں نے کہا: "کمائیٹ چلے گا۔ جتنے پیسے کہے گا تمہیں دے گا۔"

ڈرائیور بولا: "ایک ہزار روپیہ لے گا۔"

میں جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

"چلو۔ ہم تم کو ایک ہزار روپیہ ابھی دے گا۔ کیولری گراؤنڈ کی طرف چلو۔"

ٹیکسی کیولری گراؤنڈ کی طرف تیزی سے گھوم گئی۔ زاہدہ کا بنگلہ وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے ٹیکسی باہر ایک طرف کھڑی کروائی اور ڈرائیور سے کہا:

"ہم ابھی بیگم صاحب کو لے کر آتا ہے۔ تم کو ایک ہزار روپیہ بھی ابھی دے دے گا۔"

ڈرائیور بولا: "جلدی کرنا مانگتا۔"

میں دوڑ کر بنگلے کے پیچھے چلا گیا۔ زاہدہ بیڈ روم میں اسی طرح اپنے خاوند کی میت کے پاس غم زدہ بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ ظاہر ہے اپنے خاوند کے لئے مغفرت کی دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے جاتے ہی کہا:

"ٹیکسی لے آیا ہوں۔ جلدی سے ایک ہزار روپیہ رومال میں سے نکال کر مجھے دے دو۔ کیونکہ میرے پاس چھ سات سو روپے ہی ہیں۔ ٹیکسی والے نے کمائیٹ تک کے ایک ہزار روپے مانگے ہیں۔"

زاہدہ جلدی سے اٹھی۔ چھوٹے کمرے میں گئی۔ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں سو سو کے دس نوٹ تھے۔ میں نے کہا:

"اب میرے ساتھ آجاؤ۔"

زاہدہ نے اپنے خاوند کی میت کو دیکھا۔ پھر اس کے ساتھ لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے لاش سے علیحدہ کیا اور باہر لے آیا۔ برمی ٹیکسی ڈرائیور بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ہمیں دیکھا تو فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور انجن سٹارٹ کر دیا۔ بولا:

"جلدی کرو، تم لوگ ہمیں بھی مروائے گا۔"

میں اور زاہدہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ صبح کا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ کمائیٹ کی مضافاتی بستی کو رستہ سپارکس سٹریٹ میں سے ہو کر جاتا تھا۔ سولی بیگوڈا کو بائیں جانب چھوڑ کر ڈرائیور نے گاڑی سپارکس سٹریٹ کی طرف ڈال دی۔ ہر طرف شہر کی بربادی دکھائی دے رہی تھی۔ سڑکوں پر مکانوں کے ملبے کے ڈھیر لگے تھے۔ کئی عمارتوں میں سے رات کی بمباری کی آگ ابھی تک لگی ہوئی تھی۔ کوئی آگ بجھانے والا انجن وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹرام کاریں الٹی پڑی تھیں۔ دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ دکانوں کا سامان باہر سڑکوں پر بکھرا ہوا تھا۔ زاہدہ شہر کی یہ حالت دیکھ کر سہم گئی۔ کہنے لگی: "ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا: "اللہ مالک ہے۔ اب جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔"

سپارکس سٹریٹ پر اردو اخباروں کے دفاتر تھے۔ یہ دفاتر بند پڑے تھے۔ یہاں عمارتیں صحیح سلامت تھیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھی برمی لوگ ادھر ادھر دوڑتے شور مچاتے ٹولیوں کی شکل میں نظر آ جاتے تھے۔ گاڑی تباہ حال رنگون کے بازاروں میں سے نکل کر مضافات میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی کھیتوں وغیرہ میں کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس دوران ہمیں انگریز فوج کا کوئی ٹرک کوئی گاڑی کوئی فوجی کہیں نظر نہیں آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ انگریز فوج بھاگ چکی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میں کرایہ کمائیٹ جا کر ادا کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے ایک جگہ پہنچ کر گاڑی روک دی اور کچھ انگریزی' کچھ ہندوستانی میں کہا کہ مجھے کرایہ ابھی دے دو۔ ورنہ

میں یہیں سے واپس مڑ جاؤں گا۔ میں نے اسی وقت سو' سو کے دس نوٹ اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ برمی ڈرائیور نے غور سے مجھے اور زاہدہ کو دیکھا۔ میں ڈر گیا۔ کہیں اس برمی کی نیت تو خراب نہیں ہوگئی۔ اس نے ہمیں پنجابی میں باتیں کرتے سن لیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم پنجابی ہیں اور برمی لوگ پنجابیوں کے دشمن ہو گئے تھے۔ کیونکہ رنگون کے کاروبار پر مارواڑی' سورتی میمن کے بعد پنجاب کے رہنے والوں کی اجارہ داری تھی۔ اس وقت ہم برمی ڈرائیور کے رحم و کرم پر تھے۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر برمی ڈرائیور نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے مگر میں آخری دم تک مقابلہ کروں گا اور زاہدہ کو آنچ نہیں دوں گا۔

مگر خیریت گذری۔ برمی ڈرائیور نے ہمیں کمائیٹ مسز جمیل کے گھر پہنچا دیا۔ زاہدہ نے مسز جمیل کا مکان دیکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں اپنے خاوند کے ساتھ کئی بار آچکی تھی۔ راستے میں' میں زاہدہ سے پوچھتا جاتا تھا کہ ڈرائیور ٹھیک راستے پر جا رہا ہے ناں؟ وہ مجھے بتا دیتی کہ ہاں یہی راستہ کمائیٹ کو جاتا ہے۔ مسز جمیل کا گھر آیا تو میں نے کلمہ شکر پڑھا۔ ڈرائیور ہمیں اتار کر چلا گیا۔ مسز جمیل کا مکان لکڑی اور بانس سے بنا ہوا چھوٹا بنگلہ تھا۔ رنگون کے مضافات میں چھوٹے چھوٹے بنگلے لکڑی کے چبوتروں پر بانس اور لکڑی کی مدد سے اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ میں اسے مکان ہی لکھوں گا۔ مکان پر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی مرغی تک باہر دکھائی نہ دے رہی تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"خدا کرے کہ یہ لوگ گھر پر ہی ہوں۔"

زاہدہ آگے آگے چلتی مکان کے لکڑی کے دروازے تک گئی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ زاہدہ نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ تیسری بار دستک دینے کے بعد اندر سے کسی نے پوچھا:

"کون ہے؟"

یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ زاہدہ نے بے تاب ہو کر کہا: "مسز جمیل میں ہوں زاہدہ۔"

فوراً دروازہ کھل گیا۔ سامنے چالیس پینتالیس سال کی ایک دراز قد بھاری جسم کی عورت کھڑی تھی، جس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ چہرے سے وہ بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ زاہدہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

میں ایک طرف چہرہ لٹکائے کھڑا رہا۔ مسز جمیل نے زاہدہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا:۔ "گھبراؤ نہیں زاہدہ۔ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ جمیل صاحب انسن تک گئے ہیں۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ انگریزوں کی فوج جاپانیوں کا زبردست مقابلہ کر رہی ہے۔"

جب زاہدہ نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ اسکا خاوند رات کی بمباری میں اللہ کو پیارا ہو گیا ہے تو مسز جمیل نے اسے گلے لگا لیا اور اب وہ بھی رونے لگیں۔ کوئی پندرہ بیس سیکنڈ تک دونوں عورتیں روتی رہیں۔ میں خاموش سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے اس دوران ارد گرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ دائیں بائیں کوئی بنگلہ نہ تھا۔ ایک کیلے کے درختوں کا باغ تھا۔ اس کے کونے پر کچھ بانس کے مکان نظر آ رہے تھے، ساری بستی پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

مسز جمیل، زاہدہ کو دلاسا دیتے اندر لے گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی کمرے میں چلا گیا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ جس طرح اس زمانے میں متوسط گھرانوں میں ڈرائننگ روم سجائے جاتے تھے۔ یہ بھی سجا ہوا تھا۔ مگر ہر شے سے ایک اداسی ٹپک رہی تھی۔ یہاں بھی کونے میں ریڈیو گرام پڑا تھا۔ ہم بانس کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ پھر زاہدہ نے آنسوؤں بھری آواز میں مسز جمیل کو سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح بمباری میں وہ اور مشتاق مکان سے نکل کر بھاگے اور پھر کیسے ایک بم کا ٹکڑا مشتاق کے سر پر لگا اور وہ وہیں گر پڑا۔ مسز جمیل زاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دیتی رہیں۔ اس کے بعد اس نے پوچھا:

"میت کو کہاں رکھا ہے؟"

میں نے جواب میں کہا: "امانت کے طور پر بنگلے کے بیڈ روم میں ہی رہنے دیا ہے۔ حالات ذرا ٹھیک ہوئے تو اسے باقاعدہ قبرستان میں دفن کر دیں گے۔"

مسز جمیل بولیں: "انشاء اللہ! حالات جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

زاہدہ کہنے لگی: "ہماری ٹیکسی رنگون شہر کی سڑکوں پر سے گزری تو مجھ سے شہر کی تباہی نہیں دیکھی گئی۔ لاشیں ہی لاشیں پڑی ہیں۔ بلڈنگ ملبے کا ڈھیر ہو گئی ہیں۔ خدا جانے آگے کیا ہو گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" مسز جمیل نے زاہدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "جمیل صاحب کہہ رہے تھے کہ انگریز کبھی رنگون شہر نہیں چھوڑے گا۔"

معلوم ہوا کہ مسز جمیل کا خاوند مسٹر جمیل منہ اندھیرے اپنی جیپ لے کر انسن چلا گیا تھا جہاں اس کا دفتر تھا۔ انسن رنگون ہی کی ایک بستی ہے

جہاں ریلوے کی ورکشاپ بھی تھی۔ جمیل صاحب کا پھلوں کا کاروبار تھا۔ گودام اور مکان تو کمائیٹ میں تھا اور ہیڈ آفس بھی انہوں نے مکان کے ساتھ ہی بنایا ہوا تھا۔ انسن میں ان کے دفتر کی برانچ تھی جہاں ان کا منیجر بیٹھتا تھا۔ اس کے بعد مسز جمیل نے میرے بارے میں زاہدہ سے پوچھا تو زاہدہ نے اسے میرا نام بتاتے ہوئے کہا:

"یہ میرا خالہ زاد ہے۔ ایک مہینہ ہوا لاہور سے رنگون کی سیر کرنے میرے پاس آیا تھا۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی مصیبت پھنس گیا ہے۔"

مسز جمیل کہنے لگی: "یہ بھی ایک اتفاق ہی ہو گیا کہ ہم نے ایک مہینہ پہلے بچوں کو ان کی دادی کے پاس امرتسر بھیج دیا تھا۔ سکول میں ان کی چھٹیاں تھیں۔ سوچا اس بار یہ چھٹیاں امرتسر جاکر منائیں۔ بچے یہاں ہوتے تو وہ کتنے پریشان ہوتے۔ رات کو رنگون کی طرف سے دھماکوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ جاپانیوں کے جہاز ہمارے مکان کے اوپر سے اڑتے ہوئے گئے تھے۔ میں اور جمیل صاحب جاگ رہے تھے۔ رات کے تین چار بجے دھماکے بند ہوئے تو جمیل صاحب جیپ لے کر انسن چلے گئے۔ میں نے انہیں بہت روکا مگر وہ بولے۔۔۔ سیف میں کافی رقم پڑی ہے۔ وہ یہاں لے آؤں۔"

پھر وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے بولی: "ابھی تک نہیں آئے۔ خدا خیر کرے۔ تم نے جو رنگون شہر کی تباہی و بربادی کا حال سنایا ہے' اس سے تو میرا دل ڈوبنے لگا ہے۔"

اب میں نے مسز جمیل کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا: "ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے آنٹی' شہر میں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں زاہدہ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ زاہدہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مسز جمیل کی باتیں بالکل نہیں سن رہی۔ اچانک اس نے مسز جمیل کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا:

"باجی! میں مشتاق کی میت اکیلی چھوڑ آئی ہوں۔ قیامت کے دن وہ مجھ سے پوچھے گا تو میں کیا جواب دوں گی۔"

یہ کہا اور زاہدہ بچوں کی طرح پھوٹ کر رونے لگی۔ مسز جمیل اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے ساتھ لگالیا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا:

"تم نے میت کو امانۃً وہاں چھوڑا ہے۔ میت کو امانت کے طور پر رکھ دیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جائز بات ہے۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ جمیل صاحب تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ پھر ہم میت کو وہاں سے لے آئیں گے۔
"

اس بات کو بمشکل ایک گھنٹہ گذرا ہو گا کہ جمیل صاحب بھی آگئے۔ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ زاہدہ کو دیکھا تو سب سے پہلا سوال یہی کیا:

"مشتاق صاحب بھی آگئے ہیں ناں؟"

اس کے جواب میں زاہدہ دوپٹے سے آنکھیں ڈھانپ کر رونے لگی۔ مسز جمیل نے انہیں ایک طرف لے جا کر بتایا کہ مشتاق صاحب بمباری کے دوران گھر کے اندر ہی ہلاک ہوگئے ہیں اور ان کی لاش مکان میں ہی پڑی ہے۔ جمیل صاحب زاہدہ سے اظہار افسوس کرنے لگے۔ پھر مسز جمیل نے

ان سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر سرسری طور پر سر تھوڑا سا ہلایا اور صوفے پر نقاہت کے عالم میں گرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا:

"میرا انسن والا دفتر برمی سوشلسٹ پارٹی والوں نے لوٹ لاٹ کر تباہ کر دیا ہے۔ منیجر کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

پھر پینے کے لئے پانی مانگا۔ پانی پی کر بولے: "پانسہ پلٹ گیا ہے۔ انگریز فوج بھاگ گئی ہے۔ جاپانی فوجیں آج شام تک رنگون شہر میں داخل ہو جائیں گی۔"

یہ سن کر ہم سب کے چہرے اتر گئے۔ مسز جمیل صوفے کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ وہیں بیٹھ گئیں اور پوچھا: "اب کیا کریں؟"

جمیل صاحب نے افسوس کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "اب یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ رنگون کے سارے گجراتی' مارواڑی' پنجابی' پٹھان' تامل' تلیگو ---- سب رنگون چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ مارکیٹوں پر برمیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ انگریزوں نے ہمیں مروا دیا ہے-----"

زاہدہ کا رنگ بھی زرد پڑ گیا تھا۔ مسز جمیل کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا: "مگر ہم یہاں سے نکل کر کدھر جائیں گے؟"

جمیل صاحب نے کہا: "کلکتہ ---- اور کہاں۔ سبھی ادھر کو جا رہے ہیں۔"

"مگر کلکتہ تو بہت دور ہے۔ کیا ہم ریل گاڑی پر جائیں گے؟"

"ریل گاڑی؟" جمیل صاحب نے طنز کے انداز میں کہا۔ "خدا کے بندی اگر سر کے بل چل کر پہنچ جائیں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں گے۔"

پھر وہ اٹھے اور کسی کو فون کرنے کے لئے ڈائل پر نمبر گھمانے لگے۔

مسز جمیل نے کہا: "فون تو صبح سے بند ہے۔"

جمیل صاحب نے ریسیور زور سے رکھ دیا۔ اور پنجابی میں انگریزوں کو گالی دے کر صوفے پر اپنے آپ کو گرا دیا۔

"ہمیں کلکتے تک پیدل جانا ہو گا۔ قسمت اچھی ہوئی۔ زندگی خدا نے باقی لکھی ہوئی تو زندہ پہنچ جائیں گے۔ ورنہ کچھ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ جنگل کے شیر ہمیں کھا جائیں گے۔ بھوک پیاس سے مر جائیں گے یا برمی جنگلوں کے وحشی خونخوار ڈاکو ہمیں ہلاک کر دیں گے۔"

مسز جمیل تو رونے لگ پڑی۔ زاہدہ پہلے ہی غم سے نڈھال تھی۔

میں نے ان سب کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

"اگر سب لوگ پیدل جائیں گے تو جنگل کا راستہ محفوظ ہو جائے گا۔ جنگلی درندے انسانوں کی گذر گاہوں کے نزدیک کم ہی آتے ہیں اور پھر یہ کوئی اتنا لمبا سفر بھی نہیں ہے۔"

یہ بات میں نے بغیر تحقیق کے کہہ دی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جمیل صاحب رنگون سے کلکتے تک کے سارے پیدل سفر کا پورا حساب کتاب لگوا کر آئے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور طنز بھرے لہجے میں کہا:

"میاں برخوردار! لگتا ہے تم ابھی تک لاہور کے رنگ محل چوک میں بیٹھے ہو۔ تمہیں ابھی رنگون آئے چھ ماہ بھی نہیں ہوئے اور ہم نے یہاں

ساری عمر گذار دی ہے۔ رنگون سے بنگال کی سرحد کاکسز بازار تک ایک طویل' دشوار گذار' خطرناک درندوں' زہریلے حشرات الارض' وحشی جنگلی ڈاکوؤں اور خون چوسنے والی چیونٹیوں' جونکوں سے بھرے ہوئے دلدلوں سے بھرا ہوا جنگل ہی جنگل ہے۔ پہاڑ ہیں۔ پہاڑیاں ہیں۔ بیچ میں سمندر بھی آجاتا ہے۔ کوئی سڑک نہیں۔ کچھ نہیں کھانے کو ملتا۔۔ کہیں کہیں تو میلوں تک پانی نہیں ملتا۔۔ جب چلو گے تو نانی یاد آجائے گی۔"

مسز جمیل کہنے لگیں: "ہم یہاں سے چین نہیں جاسکتے؟"

جمیل صاحب بولے: "تم ان پڑھ عورت ہو۔ کہاں برما' کہاں چین۔"

پھر جلدی سے اٹھے اور کہا: "جتنی جلدی ہو سکے' ضروری چیزیں الگ کر کے رکھو۔ بینک میں تو جو روپیہ پڑا تھا' وہ تو ڈوب گیا۔ گھر میں جو نقدی ہے' وہ لفافے میں ڈالو۔۔۔ ایک بوری میں کچھ آٹا' چاول' نمک مرچ اور چائے کے ڈبے ڈالو۔ دو چار کمبل چادریں بھی رکھ لو۔ ہم یہ ساری چیزیں جیپ میں ڈال کر اللہ کا نام لے کر چل پڑیں گے۔"

مسز جمیل کہنے لگیں: "جمیل صاحب' آپ کو اتنا بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ زاہدہ کو دیکھیں۔ یہ بھی تو رنگون سے نکلی ہے۔ یہ تو اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی۔ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

جمیل صاحب نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا: "تو پھر ایسا کرو کہ تم اپنی سہیلی کے ساتھ یہاں بیٹھو اور جاپانیوں کا انتظار کرو۔ میں آج شام ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

میں نے جمیل صاحب سے پوچھا: "کیا لوگ رنگون کی کسی خاص سمت سے قافلوں کی شکل میں نکل رہے ہیں؟"

جمیل صاحب بولے: "میاں برخوردار! لوگ قافلوں کی شکل میں بھی نکل رہے ہیں اور اکیلے اکیلے خاندان بھی جانیں بچا کر چل پڑے ہیں۔ بہرحال جہاں تک میں سمجھتا ہوں دریائے ایراوتی پار کرنے کے بعد جنگل میں پہنچ کر ان کا ایک ہی قافلہ بن جائے گا۔"

اچانک باہر کسی نے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ ہم سب خوف کے مارے سہم گئے اور ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ پھر جمیل صاحب جلدی سے اٹھے۔ "میں دیکھتا ہوں کون ہے۔"

اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

مسز جمیل دوڑ کر دروازے تک گئیں۔

وہ دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگیں۔ باہر سے جمیل صاحب کے کسی سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ مسز جمیل نے آکر کہا:

"ہمارا پرانا بوڑھا نوکر میانگ پھو ہے۔ خدا خیر کرے۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔"

اتنے میں جمیل صاحب بھی آگئے۔ آتے ہی بولے:

"میانگ پھو تھا۔ بڑی خراب خبر لایا ہے۔ کہتا ہے جاپانی فوجیں سنکی پوائنٹ میں پہنچ گئی ہیں۔ اسکا مطلب ہے کہ شام تک ان کے فوجی ٹرک یہاں کمائیٹ پہنچ جائیں گے۔ خدا کے لئے جو کچھ سمیٹنا ہے' جلدی سے سمیٹو اور یہاں سے بھاگنے کی تیاری کرو۔ جاپانی فوجی شہریوں کو قیدی نہیں بناتے۔ گولی مار دیتے ہیں۔"

مسز جمیل نے اٹھ کر ضروری سامان نکالنا شروع کر دیا۔ زاہدہ دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کئے خدا سے نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگ رہی تھی۔ میں خود اندر سے پریشان تھا کہ اگر واقعی کلکتے تک پیدل چلنا پڑے گا تو یہ سفر کیسے طے ہو گا۔ جمیل صاحب دوسرے کمرے میں گھس گئے۔ زاہدہ نے آنکھیں کھول کر کمرے کی چھت پر ایک نظر ڈالی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہا:

"خدا کے لئے مجھے رنگون لے جاؤ۔ میں مشتاق کی لاش کو اپنے ہاتھوں دفن کرنا چاہتی ہوں۔ یہ لوگ تو اب رنگون نہیں جائیں گے۔"

بات اس نے بالکل ٹھیک کہی تھی۔ اب ان لوگوں کا پروگرام رنگون یا انسن جانے کا نہیں تھا۔ میں نے زاہدہ کا دل رکھنے کے لئے کہا:

"اگر یہ لوگ رنگون نہ بھی گئے تو میں خود کسی نہ کسی طرح رنگون جاؤں گا اور مشتاق صاحب کی میت کو اپنے ہاتھوں دفن کر دوں گا۔"

زاہدہ میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے بھی ساتھ لے چلنا۔ میں اپنے ہاتھوں اپنے خاوند کو قبر میں اتارنا چاہتی ہوں۔ ورنہ قیامت کے دن مشتاق مجھ سے ضرور پوچھے گا۔ زاہدہ! تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میری میت کو زمین میں دفن بھی نہ کیا۔"

زاہدہ کو یہی ایک غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنے خاوند کو دفن نہیں کر سکی اور اس کی لاش کو بے گور و کفن گھر میں چھوڑ کر آ گئی ہے۔ حالانکہ رنگون میں ہزاروں ماؤں کے بیٹوں کی کٹی پھٹی بے گور و کفن لاشیں بازاروں، گلیوں، پارکوں میں اور بلڈنگوں کے ملبے کے نیچے پڑی تھیں۔ اس وقت مجھے زاہدہ پر کچھ غصہ بھی آنے لگا اور میرا جذبہ رقابت بھی پوری شدت سے ابھر آیا تھا۔ مگر زاہدہ کی شکل دیکھتے ہی یہ سب کچھ کافور ہو گیا۔

واقعی میں زاہدہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔

ہم تو اپنے ساتھ سوائے نقدی اور سونے کی دو چار چیزوں کے اور کچھ بھی نہیں لائے تھے۔ مسز جمیل اور اس کے خاوند نے ساری الماریاں اور صندوق کھول رکھے تھے اور ان میں سے ایسی چیزیں چھانٹ رہے تھے جو

ساتھ لے جاتی تھیں اور جو نوکروں کو دے کر باقی الماریوں میں بند کر کے مکان کو تالا لگا دینا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ تجویز جمیل صاحب ہی کی تھی کہ جاپانیوں کا رنگون پر قبضہ ہو جانے کے بعد وہ کلکتے سے واپس رنگون ضرور آئیں گے۔ اپنا مکان اور سامان وہ پرانے برمی ملازم پھونگ کے حوالے کر جائیں گے۔ واپس آئیں گے تو اس سے مکان واپس لے لیں گے۔ آخر جاپانیوں کو وہاں کاروبار کرنے والے تاجروں کی ضرورت ہوگی۔

زاہدہ نے مسز جمیل کو بتایا کہ وہ اپنے ساتھ نقدی اور کچھ زیور بھی لائی ہے۔ مسز جمیل نے اپنی سونے کی چیزوں کے ساتھ زاہدہ کی چوڑیاں' کانٹے اور لاکٹ بھی امانت کے طور پر رکھ لئے۔ تین ہزار روپے جو زاہدہ کے پاس رہ گئے تھے' وہ اس نے اپنے پاس ہی رکھے۔ مجھے زاہدہ نے جو پانچ چھ سو کے قریب روپے دیئے تھے۔ وہ کرنسی نوٹوں کی صورت میں میری کمر کے ساتھ رومال میں لپٹے بندھے ہوئے تھے۔

مسز جمیل اور جمیل صاحب نے دو چمڑے کے بڑے سوٹ کیس اور ایک چھوٹا سوٹ کیس ضروری سامان سے بھر کر ڈرائنگ روم میں ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد سب نے مل کر کھانا کھایا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ زاہدہ بے دلی سے کھانا کھا رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد مسز جمیل چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت دوپہر کے تین بجنے والے تھے۔ صبح سے کوئی جاپانی بمبار جہاز ہمارے اوپر سے اڑ کر رنگون کی طرف نہیں گیا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی طرف سے فائرنگ یا کسی فوجی گاری کے گذرنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ یہ ایسی خاموشی تھی جس قسم کی خاموشی قبرستانوں میں دوپہر کے وقت ہوا کرتی ہے۔

پھر اچانک کڑاکے کی آواز بلند ہوئی جیسے ہمارے اوپر سے ریل گاڑی گذر گئی ہو۔ ہم سب ڈر کر صوفوں سے نیچے قالین پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد دور ایک دھماکہ ہوا۔ پھر ایک اور کڑاکے کی آواز مکان کے اوپر سے گذر گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب یہ دھماکے مسلسل شروع ہو گئے۔ جمیل صاحب گھبرا کر بولے: "یہ توپوں کی گولہ باری ہے۔"

مسز جمیل اور زاہدہ کونے میں دبک کر بیٹھ گئیں۔ میں باہر نکل گیا۔ پیچھے سے جمیل صاحب نے چیخ کر کہا:

"باہر مت جاؤ۔ شیلنگ ہو رہی ہے۔"

میں نے مکان کے برآمدے میں آ کر دیکھا۔ آرٹلری کے گولے چیختے چلاتے بستی کمائیٹ کے اوپر سے گذر کر دور جا کر نصف دائرے کی شکل میں پھٹ رہے تھے۔ دھماکوں سے زمین ہلنے لگی تھی۔ کمائیٹ کی بستی میں جو مقامی لوگ رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں خوف زدہ ہو کر کمرے میں آ گیا۔

مسز جمیل کی خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ دوپٹہ دانتوں میں دبائے کانپ رہی تھی۔ زاہدہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ وہ بھی دہشت زدہ تھی۔ جمیل صاحب گھبرائے ہوئے کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔ کبھی ایک کھڑکی بند کرتے۔ کبھی دوسری کھڑکی بند کرتے۔ کبھی کہتے یہاں سیڑھیوں کے نیچے آ جاؤ۔ کبھی کہتے نہیں نہیں وہیں بیٹھے رہو۔ ابھی شیلنگ ختم ہو جائے گی۔

"یہ انگریزی فوج کا توپ خانہ گولہ باری کر رہا ہے۔" میں نے ان سے کہا۔

"انگریزی فوج کا توپ خانہ رنگون میں کس پر گولے برسا رہا ہے۔

یہ جاپانی فوج کی توپوں کے گولے ہیں۔"

مسز جمیل نے سہمی ہوئی آواز میں کہا: "خدا کے لئے یہاں سے نکل چلئے۔ گولے ہمارے اوپر آکر گریں گے۔"

مسٹر جمیل خود حواس باختہ ہو رہے تھے۔ کہنے لگے: "ان پھٹتے گولوں میں ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ جب تک گولہ باری ہو رہی ہے' یہیں چپکی ہو کر بیٹھی رہو۔"

توپوں کے گولے پہلے جہاں نیم دائرے کی شکل میں پھٹ رہے تھے۔ پھر اس سے آگے جا کر پھٹنے لگے۔ اس کے بعد تھوڑا اور آگے ہو گئے۔ دھماکوں کی آواز ہم سے دور ہوتی چلی گئی۔ جمیل صاحب نے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ میں برآمدے میں آگیا۔ جمیل صاحب بولے:

"برخوردار! مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ یہ جاپانی توپوں کے گولے ہیں۔ اسکا مطلب ہے کہ جاپانی فوجیں گولہ باری بند ہوتے ہی رنگون کی طرف ایڈوانس کریں گی۔ اور وہ اس بستی سے گذریں گی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا: "پھر تو ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔"

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔ گولہ باری رنگون کی طرف ہو رہی ہے۔ ہم یہاں سے شمال مشرق کی طرف اگر نکل جائیں تو ویانگ سو جنگل میں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔ وہاں میرے ایک پنجابی دوست نے درختوں کی کٹائی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اس نے وہاں اپنا ایک مکان بھی بنایا ہوا ہے۔ ہم کم از کم وہاں پہنچ کر آگے جانے کا پروگرام بنا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا: "کیا آپ کو ویانگ سو جنگل کا راستہ معلوم ہے؟"

"میں کئی بار وہاں گیا ہوں۔ کیونکہ اگر ہم یہاں گولہ باری کے رکنے کا انتظار کرتے رہے تو ہم پھنس جائیں گے۔ جاپانی فوجوں نے رنگون کی طرف ایڈوانس شروع کر دیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ادھر گولہ باری رکے، ادھر جاپان کے فوجی ٹرک کمائیٹ میں داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد ہمارا کیا حشر ہو گا، تم اسکا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ چلو۔ سامان کے صندوق میرے ساتھ جیپ میں رکھواؤ۔ ہم ابھی یہاں سے نکل چلتے ہیں۔"

کمرے میں آتے ہی جمیل صاحب نے کہا: "باہر چل کر جیپ میں بیٹھو۔ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔ جلدی کرو۔"

دونوں خوف زدہ عورتیں یعنی مسز جمیل اور زاہدہ یہ سنتے ہی دوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں نے اور جمیل صاحب نے مل کر چمڑے کے دونوں بڑے صندوق اور چھوٹا سوٹ کیس جیپ میں لادا۔ جمیل صاحب کی جیپ چاروں طرف سے ترپال سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دونوں سائیڈوں میں ہوا دان بنے ہوئے تھے جنہیں ترپال سے بارش کے وقت بند کر دیا جاتا تھا۔ جمیل صاحب ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کسی نے مکان پر الوداعی نگاہ نہ ڈالی۔ آگے گولے پھٹ رہے تھے۔ موت سامنے کھڑی تھی۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ مکان کو خدا حافظ کہتا۔

جیپ تیزی سے ایک طرف نکل گئی۔

ہمارے سروں کے اوپر سے توپوں کے گولے چیختے چلاتے شور مچاتے گذرتے اور رنگون شہر کی جانب دور جا کر دھماکوں سے پھٹ رہے تھے۔ میں جمیل صاحب کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مسز جمیل اور زاہدہ پیچھے

سامان کے درمیان بیٹھی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رنگون کا آسمان ابر آلود تھا۔ دھوپ غائب تھی۔ جس کچے راستے پر ہماری جیپ جارہی تھی' اس کی دونوں جانب درخت اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ سڑک دو تین موڑ مڑنے کے بعد ایک برساتی نالے میں داخل ہوگئی۔ نالے میں پانی نہیں تھا۔ جیپ پتھروں پر اچھلتی ہوئی برساتی نالے میں سے دوسری طرف نکل گئی۔ آگے تھوڑی دور تک اونچی اونچی گھاس میں سے گذرنے کے بعد جیپ کو جمیل صاحب نے بائیں طرف موڑ دیا۔ اب گولے ہمارے اوپر سے نہیں گذر رہے تھے۔ پھٹتے ہوئے گولوں کے دھماکے بھی دور ہوتے چلے جارہے تھے۔ گھاس اتنی اونچی تھی کہ کئی جگھوں پر جیپ اس میں چھپ گئی۔ جمیل صاحب نے پیچھے بیٹھی ہوئی عورتوں سے کہا:

"گھبرانا نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آگے ویانگ سو کا جنگل ہے۔ وہاں میرا دوست ضرور موجود ہوگا۔"

یہ جمیل صاحب کی خوش فہمی تھی۔ اس سارے علاقے میں جو قیامت برپا ہوچکی تھی۔ اسکا ابھی انہیں اندازہ نہیں تھا۔ جیپ گھاس کے اونچے نیچے میدان مین سے باہر نکلی تو گولہ باری کے دھماکوں کی آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ جمیل صاحب نے سامنے نظریں جمارکھی تھیں۔ کہنے لگے:

"وہ جو درختوں کی قطار نظر آرہی ہے' یہ ویانگ سو کا جنگل ہے۔ یہاں ہمیں اتنا موقع مل جائے گا کہ ہم بیٹھ کر سوچ سکیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ جاپانیوں نے اگر رنگون پر قبضہ کر بھی لیا تو وہ زیادہ دنوں تک یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ انگریزوں کے ساتھ اب امریکہ بھی جنگ میں

شامل ہو گیا ہے۔ ان دونوں کی فوجیں مل کر حملہ کریں گی اور جاپانیوں کو برما سے نکال دیں گی۔"

میں نے کہا: "اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا۔ ہم تو اب یہاں سے نکل رہے ہیں۔"

جمیل صاحب بولے: "میرے دماغ میں ایک پروگرام یہ بھی ہے کہ ویانگ سو کے جنگل میں اپنے دوست کے پاس کچھ وقت گذارا جائے۔ ممکن ہے اس دوران انگریزی فوج جوابی حملہ کرے اور جاپانی یہاں سے نکل جائیں۔ پھر ہم واپس اپنے گھر آجائیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے' برخوردار؟"

میں عمر میں جمیل صاحب سے بہت چھوٹا تھا مگر میں نے بہت کچھ دیکھ رکھا تھا اور بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ میں نے کہا:۔ "ایک بار جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تو وہ جتنی دیر تک یہاں رہیں گے' کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہ رہ سکے گی۔"

جمیل صاحب نے جیپ کو ایک کچی پگڈنڈی پر ڈالتے ہوئے کہا:۔

"ہاں۔۔ میں نے بھی جاپانیوں کی درندگی کی بہت سی کہانیاں سن رکھی ہیں۔ آدمیوں کو چاہے ماریں یا نہ ماریں مگر جوان عورتوں کو ضرور اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ اپنے دوست کے ٹھکانے پر پہنچ کر اس سے بھی مشورہ کرتے ہیں۔"

ہماری جیپ ویانگ سو کے جنگل میں داخل ہو گئی۔ جنگل بڑا گھنا تھا۔ یہاں جھاڑیاں درخت وغیرہ کاٹ کر چھوٹا سا راستہ بنا دیا گیا تھا۔ جہاں سے لکڑی کے شہتیر وغیرہ لے کر ٹرک گذرتے ہوں گے۔ جنگل میں ایک جگہ گھنے درختوں کا ذخیرہ آیا جہاں دن کی روشنی بہت ہی کم ہو گئی۔ درختوں کا ذخیرہ

ختم ہوا تو زمین میں سے نکلی ہوئی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیپ ان کے درمیان سے ہو کر گذر رہی تھی۔ پیچھے سے مسز جمیل نے آواز دے کر پوچھا:

"ابھی کتنی دور جانا ہے؟"

جمیل صاحب نے بلند آواز میں کہا:

"بس تھوڑی دور جانا ہو گا۔ تم ٹھیک ہو ناں؟ زاہدہ بہن بھی ٹھیک ہے ناں؟"

مسز جمیل نے تھکی ہوئی آواز میں کہا: "ہاں سب ٹھیک ہے۔"

چٹانوں والا میدان بھی ختم ہو گیا۔ اب ایک بار پھر گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ جیپ بار بار دائیں بائیں مڑ رہی تھی۔ زمین میں سے پتھر ابھرے ہوئے تھے۔ جن پر جیپ اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔ جمیل صاحب نے جیپ کی رفتار بہت آہستہ کر رکھی تھی۔ ایک جگہ مجھے کٹے ہوئے شہتیر پڑے نظر آئے۔ جمیل صاحب بولے:

"ہم پہنچ گئے ہیں۔ خدا کرے کہ میرا دوست یہاں پر موجود ہو۔"

مگر ان کا دوست وہاں پر نہیں تھا۔ کٹے ہوئے درختوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک طرف بے شمار شہتیر پڑے تھے۔ جیپ روک کر جمیل صاحب نے اپنی بیوی سے کہا:۔ "مزدور لوگ سب بھاگ گئے لگتے ہیں۔ میرا دوست ضرور گھر پر ہو گا۔ میں اتر کر دیکھتا ہوں۔"

مسز جمیل بولیں:۔ "ہم یہاں اکیلی نہیں بیٹھیں گی۔"

جمیل صاحب جھنجلا کر بولے:۔ "تم کہاں کہاں میرے ساتھ آؤ گی۔ آرام سے بیٹھی رہو۔ وہ سامنے ہی تو مکان ہے میرے دوست کا۔ میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔"

جمیل صاحب نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ان کے دوست کا بانس کا مکان بالکل خالی تھا۔ سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ جمیل صاحب نے مکان کا چکر لگایا۔ سیف کھلا پڑا تھا۔ کچن میں چینی کے برتن فرش پر ٹوٹے پڑے تھے۔ جمیل صاحب نے مایوس لہجے میں کہا:

"یہاں لوٹ مار ہوئی ہے۔ یہ برمی دہشت گردوں کی کارروائی لگتی ہے۔ خدا کرے میرا دوست بال بچوں کو لے کر نکل گیا ہو۔"

میں نے کہا: "میرا خیال ہے ہمیں بھی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ برمی غنڈے پھر یہاں آ سکتے ہیں۔"

جمیل صاحب سوچنے لگے۔ پھر کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اب شام ہو رہی ہے۔ ہم آگے بھی نہیں جا سکتے۔"

میں نے مشورہ دیا کہ ہم یہیں کسی جگہ چھپ کر رات گذار دیتے ہیں۔ صبح کے وقت کسی طرف نکل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے آگے بنگال کی طرف جاتا کوئی قافلہ مل جائے۔ ہم بھی اس قافلے میں شامل ہو جائیں گے۔ جمیل صاحب کہنے لگے:

"بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ قافلے کے ساتھ ہم جیپ میں سفر نہیں کر سکیں گے۔ آگے جنگل دلدلوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ سامان بھی ہے۔"

میں نے کہا: "سامان ہم یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

جمیل صاحب نے کہا: "ابھی کسی جگہ رات تو بسر کرتے ہیں۔ آؤ۔"

ہم نے ساری بات مسز جمیل اور زاہدہ کو جا کر بتا دی۔ دونوں مزید پریشان ہو گئیں۔ زاہدہ کو تو گویا چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ کسی سے کوئی بات نہیں

کرتی تھی۔ کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں میں جواب دے دیتی تھی۔ مجھے اسکی فکر لگی ہوئی تھی۔ یہ غم اسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا کہ وہ اپنے خاوند کی میت بے گور و کفن چھوڑ آئی ہے۔

مسز جمیل نے اپنے خاوند سے پوچھا: ''اب آپ کیا کہتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں واپس اپنے گھر میں ہی چلتے ہیں۔ جو ہو گا' دیکھا جائے گا۔ آخر جاپانی ہمیں کھا تو نہیں جائیں گے۔ میں خود ان سے بات کرلوں گی۔''

مسز جمیل واقعی اپنے خاوند کے مقابلے میں زیادہ دلیر عورت تھی۔ جمیل صاحب نے اسے جھاڑ پلاتے ہوئے کہا:

''تم چپ رہو۔ تمہیں کیا پتہ جاپانی کتنی وحشی قوم ہے۔ وہ ہمیں گولی مار دیں گے اور تم دونوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ بس اب آگے سے کچھ نہ بولنا۔ جو میں کرتا ہوں۔ مجھے کرنے دو۔''

جمیل صاحب اب صرف مجھ سے ہی مشورہ کر سکتے تھے۔ مجھے ایک طرف لے گئے اور بولے:

''ان عورتوں کی عقل الٹی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں مروادیں گی۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے ادب سے پوچھا۔

جمیل صاحب کہنے لگے: ''وہ سامنے جو ٹیلہ نظر آتا ہے۔ اس کے اندر ایک خفیہ غار ہے۔ کسی زمانے میں میرا ایک ٹھیکیدار دوست یہاں ناجائز شراب بنایا کرتا تھا۔ وہ شراب کے ڈرم اس غار میں چھپا دیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں رات اس غار میں چل کر گذارنی چاہئے۔ وہاں برمی دہشت گرد نہیں آئیں گے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

میں نے کہا: ”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

”تو پھر ایسا کرتے ہیں جیپ کو کسی جگہ درختوں میں چھپا دیتے ہیں۔ سامان اسی میں پڑا رہنے دیتے ہیں۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں ساتھ غار میں لے جاتے ہیں۔ آجاؤ۔“

ہم نے عورتوں کو جیپ سے اتارا۔ جیپ کو ذرا آگے لے جاکر ایک جگہ درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا دیا۔ اوپر درختوں کی شاخیں توڑ کر ڈال دیں۔ دور سے جیپ بالکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خشک راشن ایک تھیلے میں بھر کر ساتھ لے لیا اور جمیل صاحب کے پیچھے پیچھے چلتے ٹیلے کے پاس آ گئے۔ جمیل صاحب نے اپنی بیگم سے پوچھا:

”موم بتیاں بھی ساتھ لائی ہو کہ نہیں؟“

مسز جمیل کا منہ پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگیں:۔ ”لے آئی ہوں۔“

غار کا دہانہ ٹیلے کے عقب میں تھا اور آگے جھاڑیاں اتنی اونچی اونچی اگی ہوئی تھیں کہ غار کا منہ نظر نہیں آتا تھا۔ جمیل صاحب ہمیں لے کر جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے غار میں داخل ہو گئے۔ یہ قدرتی غار تھا۔ جمیل صاحب کے دوست نے وہاں جگہ صاف کر کے شراب کے ڈرم رکھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہاں شراب کا کوئی ڈرم نہیں تھا۔ لکڑی کے تختے غار کی دیوار کے ساتھ ضرور لگے ہوئے تھے۔ غار میں ذرا آگے گئے تو ایک کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں زمین پر دری بچھا کر عورتوں کو بٹھا دیا گیا۔ غار کے دہانے سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ پھر بھی جمیل صاحب نے ایک موم بتی روشن کر کے پتھر پر لگا دی۔ ہم نے تھرمس میں سے چائے نکال کر پی۔ میں اپنی پیالی اور کچھ بسکٹ لے کر زاہدہ کے پاس بیٹھ گیا جو غار کی دیوار سے ٹیک لگائے افسردگی

کے عالم میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی چائے پاس ہی پڑی تھی۔ میں نے اس سے دھیمی آواز میں کہا:

"خدا کے لئے اب حوصلہ کرو زاہدہ۔ اس طرح حوصلہ ہار دو گی تو اتنی بڑی مصیبت سے کیسے نکل سکو گی۔"

زاہدہ نے مردہ آواز میں کہا:

"میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی۔"

مجھے اس کے خاوند پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ مر چکا تھا اور مرے ہوئے آدمی کو برا بھلا کہنا مناسب نہیں ہوتا۔ میں نے زاہدہ کی پیالی اٹھا کر بڑی مشکل سے اسے پکڑائی۔ اس نے میرے اصرار پر چائے کے دو تین گھونٹ پئے۔ میں نے اسے ایک بسکٹ بھی کھلا دیا۔ سامنے والی دیوار کے پاس مسز جمیل اور جمیل صاحب بیٹھے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ مگر بظاہر ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی جتائی جا رہی تھی۔ مسٹر جمیل اور اس کی بیگم کے رویے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہمیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ میں نے آہستہ آہستہ یہ صورتحال زاہدہ کے گوش گذار کر دی۔ اس پر جیسے میری بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ میری باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ جب میں ذرا خاموش ہوا تو اس نے میری طرف اداس آنکھوں سے دیکھا اور بولی:۔"

مجھے واپس رنگون لے چلو۔ اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے خاوند کی میت کے پاس لے چلو۔ تم مجھے وہاں چھوڑ کر بے شک واپس آ جانا۔ خدا کے لئے مجھے واپس میرے گھر پہنچا دو۔"

مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ مگر میں اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے جمیل صاحب نے کپ زمین پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا:

"میاں! رات آ رہی ہے۔ چل کر دوست کے مکان سے ایک دو بستر ہی اٹھا لائیں۔ یہاں ننگی زمین پر عورتیں نہیں سو سکیں گی۔"

مسز جمیل بولیں:

"میرے لئے دو تکیئے بھی لیتے آنا۔"

اس عورت کو اس مصیبت میں بھی اپنی آسائش کا خیال لگا ہوا تھا۔ جمیل صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اٹھے اور مجھے بھی اٹھنے کے لئے کہا۔ ہم غار میں سے نکل کر جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں سے ہوتے ہوئے لٹے ہوئے مکان میں آ گئے۔ جمیل صاحب بولے:

"خشک گوشت تو ہم غار میں ساتھ لے گئے تھے مگر نمک مرچ تو جیپ میں پڑا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہاں کچن میں سے لے لیتے ہیں۔"

میں نے ایک بڑا گدیلا اور سنبل کے ہلکے پھلکے تین چار تکیئے لپیٹ لپیٹ کر ایک طرف رکھ لئے تھے۔ جمیل صاحب کچن کی طرف جانے لگے تو ہمیں آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم وہیں رک گئے۔ آوازیں پیچھے جو درختوں کا ذخیرہ تھا' اس طرف سے آ رہی تھیں اور قریب آتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا تین چار آدمی باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر ایک قہقہے کی بھی آواز سنائی دی۔ جمیل صاحب نے گھبراہٹ میں کہا:۔

"یہاں کہیں چھپ جاتے ہیں"

ہم مکان کے کچن والے دروازے سے جلدی سے نکلے اور درختوں میں سے ہوتے ہوئے ایک جگہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔

ہم اوپر سے ہو کر بھی غار والے ٹیلے کی طرف جا سکتے تھے مگر اب وقت نہیں رہا تھا۔ انسانی آوازوں کے ساتھ اب قدموں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ ہم جھاڑیوں کے پیچھے چھپے پتے ذرا سے ہٹا کر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ذخیرے کے درختوں کے پیچھے سے دو جاپانی فوجی نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے دو اور فوجی چلے آ رہے تھے۔ ان کی رائفلیں کندھوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور وہ بڑے مزے سے باتیں کرتے سگریٹ پیتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر تو میرا رنگ ہی اڑ گیا۔ جمیل صاحب بھی جلدی سے نیچے ہو گئے اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ان کا رنگ بھی ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ میں بھی نیچے ہو گیا۔ مگر دو شاخوں کے درمیان سے انہیں برابر دیکھ رہا تھا۔

چاروں جاپانی سپاہی جمیل صاحب کے دوست کے لٹے ہوئے مکان کے قریب آ کر رک گئے۔ انہوں نے رائفلیں تان لیں اور تیز تیز لہجے میں آپس میں جاپانی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ پھر دو جاپانی وہیں رائفلیں تانیں کھڑے رہے۔ دو مکان میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے مکان کے اندر سامان بکھرا پڑا تھا۔ وہاں آدمی تو کوئی بھی نہیں تھا۔ دونوں جاپانی سپاہی مکان سے باہر آ گئے اور اپنے باہر والے ساتھیوں سے جاپانی میں کچھ کہا۔ پھر کاندھوں پر انہیں نے رائفلیں لٹکا لیں اور باتیں کرتے سگریٹ کا دھواں اڑاتے دوسری طرف نکل گئے۔

ان کے جانے کے کافی دیر بعد جمیل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے:

”جاپانی آگئے ہیں۔ اب ہم بچ نہیں سکتے۔ عورتوں کے پاس چلو۔ ادھر سے آؤ ادھر سے۔۔۔۔“

ہم درختوں اور جھاڑیوں میں سے چھپتے چھپاتے غار میں پہنچے۔ راستے میں جمیل صاحب نے مجھے یہ تاکید کر دی کہ عورتوں کو بالکل نہ بتایا جائے کہ جاپانی آگئے ہیں۔ نہیں تو وہ اور پریشان ہو جائیں گی۔ میں نے کہا:

”میرا تو خیال ہے کہ ہمیں بھی یہاں سے پروم کی طرف چل دینا چاہیے۔ جیپ ہمارے پاس ہے۔“

جمیل صاحب بولے:

”رات کو سفر کرنا خطرناک ہے۔ لگتا ہے سارے علاقے پر جاپانی فوج پھیلی ہوئی ہے۔ صبح منہ اندھیرے نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

ہم نے غار میں جا کر مسز جمیل اور زاہدہ کو کچھ نہ بتایا کہ جاپانی علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب مسز جمیل نے پوچھا کہ بستر وغیرہ کیوں نہیں لائے تو جمیل صاحب نے بہانہ بنا دیا کہ وہاں کوئی بستر وغیرہ نہیں تھا۔ اسی طرح زمین پر سو جاؤ۔ صبح دیکھا جائے گا۔ زاہدہ اسی طرح گم سم دیوار سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مسز جمیل تھیلے میں سے خشک گوشت اور ڈبل روٹی نکالنے لگی۔ جمیل صاحب نے سگار سلگا لیا۔ پریشانی ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔ رات ہو گئی۔ غار میں موم بتی کی دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا خشک گوشت ڈبل روٹی کے ساتھ کھایا۔ زاہدہ نے بھی میرے کہنے پر تھوڑا بہت کھا لیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے حالات کی

نزاکت اور سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ اس کے بعد پھر وہی فقرہ دہرایا:

"اگر تم مجھے چاہتے ہو تو مجھے واپس رنگون چھوڑ آؤ۔"

میں نے آہستہ سے کہا:

"زاہدہ! کچھ عقل کرو۔ یہاں سے میں تمہیں کیسے رنگون لے جا سکتا ہوں۔"

زاہدہ نے غصے میں کہا:

"تو پھر میں خود چلی جاؤں گی۔ میں قیامت کے دن مشتاق کو کیا جواب دوں گی۔ میں اس کی میت کو اپنے ہاتھوں سے دفن کروں گی۔"

زاہدہ کی ذرا اونچی آواز سن کر جمیل صاحب نے پوچھا:

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا:۔ "کچھ نہیں انکل۔ زاہدہ پوچھ رہی تھی کہ ہم یہاں سے آگے کہاں جائیں گے۔"

جمیل صاحب نے اپنی گردن پر بیٹھے ہوئے مچھر کو ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"بی بی! صبح اللہ کا نام لے کر یہاں سے نکل پڑیں گے۔ قافلے پروم کی طرف سے ہو کر بنگال کی طرف جا رہے ہوں گے۔ یہی اوپر کو ایک آسان راستہ جاتا ہے۔ ہم بھی کسی قافلے میں شامل ہو جائیں گے۔ اس مصیبت میں ہم اکیلے ہی نہیں ہیں، لاکھوں لوگ تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔"

رات گہری ہونے لگی تو دونوں عورتیں غار کی ایک طرف زمین پر چادر بچھا کر لیٹ گئیں۔ جمیل صاحب اور میں ایک طرف زمین پر لیٹ گئے۔ میں نے انہیں آہستہ سے کہا:

"مکان پر جا کر گدیلا اور سرہانے نہ لے آئیں انکل؟ اس وقت تو جاپانی وہاں نہیں ہوں گے"

جمیل صاحب نے جواب دیا:۔

"یہ حماقت میں خود کروں گا' نہ تمہیں کرنے دوں گا۔ جس طرح سے بھی ہو رات گزار دو۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

ایک چادر میں نے اور جمیل صاحب نے اوپر لے لی جس سے مچھروں سے بچاؤ ہو گیا۔ دوسری چادر زاہدہ اور مسز جمیل نے اوپر اوڑھ رکھی تھی۔ موم بتی کو گل نہ کیا گیا۔ تھکان سب کو ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے جمیل صاحب کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے پہلو بدل لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک تو جمیل صاحب کے خراٹے مجھے سونے نہیں دے رہے تھے۔ دوسرے غار میں گرمی تھی۔ چادر ہٹائی تو مچھر کاٹتے تھے۔ عورتیں بیچاری نہ جانے کس طرح خاموش پڑی تھیں۔ اصل میں عورتوں میں برداشت کا مادہ مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ کچھ دیر تک میں زاہدہ کے ساتھ اپنی محبت' اس کے ساتھ لاہور میں گذارے ہوئے خوشگوار دنوں کی یادوں میں گم رہا۔ پھر اس کے خاوند مشتاق سیٹھ کے انجام پر غور کرتا رہا۔ اس کے بعد مجھے کوئی خبر نہیں کہ کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح صبح جمیل صاحب نے مجھے جگا دیا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

جمیل صاحب بولے :

"میاں ! پو پھٹنے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ یہ چادریں تہہ کر کے ساتھ رکھ لیں گے۔"

میری نظریں اپنے آپ اس طرف اٹھ گئیں جہاں رات کو زاہدہ سوئی ہوئی تھی۔ مسز جمیل چادر تہہ کر رہی تھی۔ زاہدہ وہاں نہیں تھی۔ میں مسز جمیل سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ زاہدہ کہاں رہ گئی ہے۔ مسز جمیل نے کہا :

"باہر گئی ہوگی۔ ابھی آجاتی ہے۔"

تب جمیل صاحب بولے :"بھئی جس وقت میں اٹھا تھا تو زاہدہ یہاں نہیں تھی۔ تم اکیلی ہی سو رہی تھیں۔"

مسز جمیل کہنے لگیں :"میں بھی سو رہی تھی۔ آپ نے جگایا تو اٹھی ہوں۔ زاہدہ پہلے ہی باہر نکل گئی تھی۔ ابھی آجائے گی۔ باہر منہ ہاتھ دھو رہی ہوگی۔"

میں نے سمجھا کہ وہ حوائج ضروریہ کے لئے غار سے باہر گئی ہوگی۔ بار بار خیال آنے لگا کہ جاپانی فوج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں زاہدہ زیادہ دور نہ نکل گئی ہو۔ جمیل صاحب مسز جمیل سے کہہ رہے تھے :

"خدا کی بندی ! تھرمس میں سے ایک کپ چائے تو نکال کر پلا دو۔ راستے میں نہ جانے کچھ پینے کو نصیب ہو گا بھی کہ نہیں۔ تم خود بھی ایک کپ پی لو اور برخوردار کو دو۔"

"اتنی چائے اس میں نہیں ہے۔"

مسز جمیل نے تنک کر کہا۔ جمیل صاحب بولے :

"چلو جتنی ہے، اتنی ہی دے دو۔"

مسز جمیل پلاسٹک کی پیالیوں میں تھرمس میں سے تھوڑی چائے نکال کر ڈالنے لگیں۔ جمیل صاحب کہنے لگے :

"ہمیں دن نکلنے سے پہلے اس جنگل سے شمال مغرب کی طرف نکل جانا ہو گا۔ آگے ایک بڑی ندی آتی ہے' میں نے وہ ندی دیکھی ہوئی ہے' اس کے آگے پروم قصبے کو جانے والی سڑک ہے۔"

چائے پیتے ہوئے بھی مجھے زاہدہ کی بے چینی لگی رہی۔ جمیل صاحب نے چائے جلدی جلدی حلق میں انڈیل لی تھی۔ وہ اٹھے اور بولے :

"بھئی یہ لڑکی زاہدہ نے اتنی دیر کہاں لگادی۔ بیگم تم ذرا باہر جاکر پتہ تو کرو۔"

مسز جمیل اٹھیں اور خاموشی سے غار سے باہر نکل گئیں۔ جمیل صاحب پروم قصبے تک کے سفر کے بارے میں باتیں کرنے لگے :

"میرا اندازہ کہتا ہے کہ پروم کی جانب جاپانی نہیں گئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ رنگون سے اوپر شمال کی طرف ہے۔ جاپانی رنگون کے راستے میں مل سکتے ہیں۔ فکر نہ کرو۔ مجھے سب راستے معلوم ہیں۔ ایک زندگی یہاں گذاری ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مسز جمیل آگئیں۔ کہنے لگیں :

"مجھے تو زاہدہ کہیں نظر نہیں آئی۔ خدا خیر کرے میں نے جنگل میں اسے ایک دو آوازیں بھی دی ہیں' کسی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔"

اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک دفعہ تو میرے دل کی دھڑکن ایکدم تیز ہو کر معمول پر آگئی۔ میرے دل نے کھلے لفظوں میں مجھے بتادیا کہ زاہدہ اپنے خاوند کی میت کے پاس رنگون گئی ہے۔ جمیل صاحب بولے :

"یہاں سے نکل کر جیپ تک تو چلو۔ وہ باہر کہیں ہوگی۔ اسے دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم تینوں غار سے نکلے اور درختوں جھاڑیوں میں سے گذرتے اس جگہ آ گئے جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی جس پر ہم نے درختوں کی شاخیں توڑ کر ڈال رکھی تھیں۔ راستے میں 'میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ زاہدہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرے دل نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ رات کو جب ہم سب سو رہے تھے' کسی وقت اٹھی ہے' اسے اپنے مرحوم خاوند کی میت کا خیال آیا ہے اور وہ غار سے نکل کر جنگل میں رنگون کی طرف چل پڑی ہے۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ کہیں وہ جاپانی سپاہیوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔ اسے تو ان جنگلوں میں دن کے وقت راستہ نہیں مل سکتا' رات کے اندھیرے میں وہ کہاں بھٹکتی پھر رہی ہوگی۔ میرا پریشان ہونا قدرتی بات تھی۔ جب جمیل صاحب نے اپنی بیگم کو جیپ میں بٹھایا اور مجھے بھی جیپ میں سوار ہونے کے لئے کہا تو میں نے ان کے ساتھ پروم کی طرف جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"انکل! زاہدہ میری خالہ زاد ہے۔ جب تک اس کا مجھے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے' میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

جمیل صاحب کو بھی اندر سے معلوم ہو گیا تھا کہ زاہدہ اپنے خاوند سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ اپنے مرحوم خاوند کی میت کو اپنے رنگون والے بنگلے میں چھوڑ آئی ہے۔ لہٰذا وہ ضرور رنگون ہی کی طرف نکل گئی ہے۔ کہنے لگے:

"برخوردار! زاہدہ بھابھی رنگون ہی گئی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نہ تو تمہارے ساتھ یہاں بیٹھ کر زاہدہ کا انتظار کر سکتا ہوں اور نہ تمہیں

اس کے پاس رنگون لے جاسکتا ہوں۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں ویانگ سو کے جنگل سے نکال کر کمائیٹ کے اس قصبے تک پہنچا سکتا ہوں جہاں سے ایک سڑک رنگون کو نکلتی ہے۔"

میں نے کہا: "میں آپ کا شکر گذار ہوں گا۔ مجھے وہاں تک لے چلیئے۔"

اور میں جیپ میں سوار ہو گیا۔ جمیل صاحب جیپ کو دوسرے راستے سے جنگل سے نکال کر لے گئے۔ یہ راستہ دلدلوں اور برساتی ندی نالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس طرف سے کسی فوج کے اور خاص طور پر جاپانی فوج کے آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ اب انہیں دشوار گذار راستوں سے چھپ چھپا کر رنگون کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں جمیل صاحب نے ہمیں رات کو غار میں چھپایا تھا' وہ راستہ جنگل میں سے سیدھا کمائیٹ کی طرف سے ہو کر رنگون جاتا تھا۔ جمیل صاحب راستے میں کہنے لگے:

"اسکا مطلب ہے کہ جاپانیوں نے کمائیٹ میں بھی اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر بنایا ہو گا۔ رات والے فوجی کمائیٹ کی طرف ہی جا رہے تھے۔"

اس پر مسز جمیل نے چونک کر پوچھا:

"کیا رات کو آپ نے جاپانی سپاہی دیکھے تھے؟"

تب جمیل صاحب نے اپنی بیوی کو سارا قصہ سنا دیا۔ وہ مارے خوف کے زرد پڑ گئیں اور خدا سے دعائیں مانگنے لگیں کہ ہمیں اس مصیبت سے نکالنا۔ ہمیں جاپانی سپاہیوں کی قید سے بچانا۔ لیکن تقدیر ان کے ساتھ بھی کیسا بھیانک سلوک کرنے والی تھی۔ اس کی ان دونوں میں سے کسی کو خبر نہیں

تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کی طرح رنگون شہر اور برما کے دوسرے شہروں میں سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کے قافلے بنگال کی طرف چل تو پڑے تھے مگر ان کے ساتھ خطرناک جنگلوں میں کیا قیامت گزرنے والی تھی' انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔

جمیل صاحب ایک راستے سے جیپ کو نکال کر لائے۔ جہاں ہمیں راستے میں ایک بھی جاپانی سپاہی نہ ملا۔ قصبے تک پہنچتے پہنچتے ہمارے اوپر سے تین چار جاپانی فوجی جہاز گذرے۔ ان میں ایک بہت بڑا چار پنکھوں والا جہاز بھی تھا۔ جمیل صاحب نے بتایا کہ یہ فوجی ٹرانسپورٹ طیارہ ہے۔ اس وقت دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ جب ہماری جیپ ایک پہاڑی قصبے کے دوراہے پر پہنچ کر رک گئی۔ مسز جمیل نے مجھ سے کہا:

"زاہدہ کے زیور اس کی امانت کے طور پر ہمارے پاس ہیں۔ یہ لاکٹ' ہار' چوڑیاں اور کانٹے ہیں۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے لے سکتے ہو۔"

میں نے کہا: "نہیں آنٹی! یہ آپ اپنے پاس ہی رکھیں' میرا کوئی پتہ نہیں مجھے کہاں کہاں زاہدہ کو تلاش کرنا پڑے گا اور میرے ساتھ کیا گذرے گی۔"

جمیل صاحب نے جیپ سے اتر کر مجھے گلے سے لگایا اور کہا:

"میاں! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ زاہدہ کے زیور اس کی امانت کے طور پر ہمارے پاس ہیں' اگر ہم زندہ بچ کر امرتسر پہنچ گئے تو ہمارے پاس محفوظ ہوں گے۔ میرا امرتسر کا ایڈریس زاہدہ کے پاس ہے' ہاں اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

میں نے جمیل صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے پاس ضرورت کے مطابق رقم موجود ہے۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھے تاکید کی کہ یہ سڑک سیدھی رنگون جاتی ہے۔

"میرا خیال ہے رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا ہو گا' ایسی صورت میں وہاں جو رہ گیا ہو گا' اب وہیں بیٹھا ہو گا۔ تم بھی کسی مسلمان پنجابی یا گجراتی کے پاس چلے جانا اور اس کے بعد زاہدہ کے بنگلے پر جانا۔ اکیلے گئے تو جاپانی جاسوسی کا الزام لگا کر پکڑ لیں گے۔ اگر تم نے کسی پنجابی یا گجراتی تاجر کی دوکان کا بتایا کہ تم وہاں ملازم ہو تو ہو سکتا ہے تمہاری جان بچ جائے۔۔۔ اچھا اب جاؤ۔۔۔ خدا حافظ......!"

"خدا حافظ۔"

جمیل صاحب کی جیپ تیزی سے آگے نکل گئی اور میں رنگون جانے والی چھوٹی سی سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک کی دونوں جانب درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ کہیں سنبل کے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ کہیں جنگلی کیلوں کے درخت اور کہیں بیچ میں سے ناریل کے چھتری دار درخت سر نکالے جھکے ہوئے تھے۔ اب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر یہ کالی گھٹائیں نہیں تھیں۔ دسمبر' جنوری کے مہینوں میں ان علاقوں میں برسات کی گھٹائیں جھوم جھوم کر نہیں آتیں۔ کبھی بھورے رنگ کے اور کبھی سفید سفید بادل آجاتے ہیں اور ہلکی بارش برسا کر چل دیتے ہیں۔ مگر اب یہ بھورے بادل دو روز سے رنگون کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ بارش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گذرا۔ بانس کے جھونپڑی نما مکان خالی

پڑے تھے۔ ایک برمی کسان کھیت کے پاس بیٹھا سفید چٹا یعنی سگار پیتا نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا مگر کوئی بات نہ کی۔ میں برمی زبان بالکل نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی برمی لوگوں سے جاپانیوں کے بارے میں پوچھتے ہوئے میں گھبراتا تھا۔ کیونکہ یہ خیال عام تھا کہ برمی لوگ جاپانیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ رنگون میں تو لوگوں کا کہنا تھا کہ برمی ففتھ کالم والوں نے ٹارچ کی روشنیوں کے سگنل دکھا دکھا کر جاپانیوں سے بمباری کرائی ہے۔ جس سڑک پر میں چلا جا رہا تھا' اصل میں یہ سڑک رنگون نہیں جاتی تھی بلکہ آگے جا کر رنگون کو جانے والی بڑی سڑک کے ساتھ مل جاتی تھی۔ جب میں بڑی سڑک پر آیا تو یہاں تباہ حال لوگوں کو قافلوں کی شکل میں آگے جاتے دیکھا۔ میں سڑک پر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ بیل گاڑیوں' اپنی گاڑیوں اور گڈوں پر سامان لادے عورتوں بچوں کو بٹھائے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں میں پنجابی بھی تھے۔ سورتی میمن اور گجراتی بھی تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا:

"کیا رنگون میں جاپانی آ گئے ہیں؟"

اس شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کہنے لگا۔

"کچھ معلوم نہیں۔ ہم برباد ہو گئے ہیں۔"

اور وہ آگے نکل گیا۔

میں اس طرف چلنے لگا' جس طرف سے لٹے پٹے تباہ حال لوگوں کے قافلے ٹکڑیوں کی شکل میں چلے آ رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد سڑک خالی ہو گئی۔ ایک آدمی سائیکل پر صندوق اور گٹھڑی لادے چلا آ رہا تھا۔ وہ شکل ہی سے سورتی میمن لگتا تھا۔ میں نے اس سے جاپانیوں کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا:

”رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ تم کدھر جا رہے ہو۔“

میں نے اسے بتایا کہ رنگون اپنے ایک بھائی کا پتہ کرنے جا رہا ہوں۔ وہ آدمی بولا:

”مارے جاؤ گے۔ بھائی کو اس کی قسمت پر چھوڑو اور اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ۔“

مگر مجھے ہر حالت میں زاہدہ کے پاس پہنچنا تھا۔ اسے تلاش کر کے اپنے ساتھ لانا اور بنگال جاتے کسی قافلے میں شامل ہونا تھا۔ میں رنگون کی طرف چلنے لگا۔

ذرا آگے گیا تو رنگون سے بھاگے ہوئے ہندوستانیوں کا ایک اور قافلہ چلا آرہا تھا۔ ان لوگوں کی شکلیں دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ لوگ انتہائی بدحواسی کے عالم میں رنگون سے بھاگے ہیں۔ اس قافلے میں بھی گڈے اور چھکڑے تھے جن کے آگے بیل جتے ہوئے تھے۔ ان پر سامان لدا تھا اور عورتیں' بچے اور بوڑھے مرد پریشانی کی حالت میں بیٹھے تھے۔ جوان مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ کچھ چھکڑوں کو برمی اور کچھ گڈوں کو تامل لوگ چلارہے تھے۔ یہ قافلہ بھی میرے قریب سے گذر گیا۔ سڑک ایک بار پھر خالی ہوگئی۔ سڑک پر جگہ جگہ چیتھڑے اور گتے کے ٹوٹے ہوئے ڈبے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ آگے ایک چھوٹا سا چوراہا آگیا۔ مگر میں اسی سڑک پر ہی چلتا گیا جس پر چیتھڑے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ اسی بات کی نشانی تھی کہ یہ سڑک رنگون کو جارہی ہے۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت تھے جو ویران پڑے تھے۔ ان کے پیچھے دور پہاڑیوں کے سلسلے نظر آرہے تھے۔ سامنے ابھی تک رنگون شہر کے آثار دکھائی نہیں دیئے تھے۔ پیچھے سے ایک ٹرک کی آواز آئی۔ میں سڑک سے اتر کر درختوں کے پاس آگیا۔

ٹرک تیزی سے آگے نکل گیا۔ یہ جاپانیوں کا فوجی ٹرک تھا۔ ایک جاپانی فوجی رائفل لئے ٹرک کی چھت میں سے سر نکالے کھڑا تھا۔

میں نے خدا سے دعا کی:۔یا اللہ! زاہدہ کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ وہ خیریت سے اپنے مکان پر پہنچ گئی ہو۔ کہیں ادھر ادھر بھٹک گئی تو پھر شاید قیامت تک اس کی شکل نہ دیکھ سکوں گا۔ میں نوجوان تھا۔ جسم میں تازہ خون دوڑ رہا تھا۔ پیدل چلنے سے مجھے ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد رنگون شہر کے مضافات شروع ہو گئے۔ اسکی نشانی میں سب سے پہلے مجھے سڑک کے کنارے ایک بہت بڑا گڑھا نظر آیا جس میں سے پانی نکل رہا تھا۔ یہ گڑھا توپ کے گولے کے پھٹنے سے بن گیا تھا۔ آگے اس قسم کے تین چار گڑھے اور ملے۔ اب رنگون کی طرف سے کوئی قافلہ نہیں آ رہا تھا۔ بانس کے چبوتروں پر بنے ہوئے لکڑی کے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اکثر مکان خالی پڑے تھے۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دو مکانوں کے باہر برمی لوگ دکھائی دیئے۔ انہوں نے میری طرف بالکل نہ دیکھا۔ آگے ایک نالے کا پل آگیا۔ پل کی دوسری جانب پکی سڑک تھی۔ کچھ فاصلے پر رنگون کے بودھی پیگوڈے کے کلس نظر آئے۔ میں رنگون شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر یہ رنگون کا جنوب مشرقی علاقہ تھا اور میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ سامان ادھر ادھر سڑک پر بکھرا پڑا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ رنگون کے سولی پیگوڈا کی جانب کونسی سڑک جاتی ہے۔ کیونکہ سولی پیگوڈا کے پیچھے کیولری گراؤنڈ کے پاس مشتاق سیٹھ کا بنگلہ تھا اور زاہدہ کو وہیں جانا تھا۔

میں موڑ گھوم کر دوسری بڑی سڑک پر آیا تو کچھ رکشے چلتے دیکھے۔ لوگ بھی ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ یہ سب برمی لوگ تھے۔ ان میں ایک بھی پنجابی یا سورتی یا گجراتی یا تامل نہیں تھا۔ ایک فوجی جیپ تیزی سے سڑک پر سے گذر گئی۔ اس میں جاپانی فوجی سوار تھے۔ میں فٹ پاتھ پر آگیا۔ یہ فٹ پاتھ چھتا ہوا تھا۔ دکانیں یا بند تھیں یا ٹوٹی پڑی تھیں۔ ایک ہندوستانی بڑا سا تھیلا اٹھائے سامنے سے چلا آرہا تھا۔ میں نے اس سے سولی پیگوڈا کو جانے والی سڑک کا پوچھا تو وہ رکا بالکل نہیں۔ چلتے چلتے صرف اتنا بتا گیا کہ چلتے جاؤ' آگے سولی پیگوڈا آجائے گا۔ میں ایک بڑی سڑک پر آگیا' جس کی ایک جانب پارک تھا۔ پارک ویران پڑا تھا۔ مجھے ابھی تک جانی پہچانی کوئی عمارت نظر نہیں آئی تھی۔ میں پارک کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتا دوسری سڑک پر آگیا۔ یہاں بھی چند برمی آدمی سائیکلوں پر سوار دیکھے جن کے ہاتھوں میں جاپان کے جھنڈے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے۔

میں ایک طرف ہو گیا۔ جب یہ سائیکل سوار آگے نکل گئے تو میں بلڈنگوں کے بالکل ساتھ ہو کر چلتا گیا۔ میں حیران تھا کہ مجھے ابھی تک رنگون کا سر پیر سمجھ میں نہیں آیا۔ زاہدہ کیسے رات کے اندھیرے میں اپنے مکان تک پہنچی ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ وہ مجھ سے پہلے رنگون میں آکر رہنے لگی تھی۔ ہو سکتا ہے اسے سڑکوں سے شناخت ہو۔ آخر مجھے ایک عیسائی پادری مل گیا۔ وہ سامنے سے فٹ پاتھ پر چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صلیب نما تعویذ تھی۔ میں نے اسے سلام کیا اور پوچھا کہ سولی پیگوڈا کو کونسی سڑک جاتی ہے۔ پادری نے رحم بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہندوستانی میں کہا:

"تم مجھے پنجابی لگتے ہو بیٹا۔ سولی پیگوڈا کی جانب مت جاؤ۔ جاپانیوں کو جس پر ذرا سا بھی پنجابی ہونے کا شک پڑ جاتا ہے' وہ اسے پکڑ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا: "فادر! میں پنجابی ضرور ہوں مگر میری ایک کزن گھر میں اکیلی رہ گئی ہے۔ میں اسے لینے جارہا ہوں۔"

پادری صاحب نے بڑی شفقت سے کہا:

"میں تمہیں اس طرف جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ بہتر ہے کہ اپنی کزن کو خدا کے سپرد کردو اور یہیں سے واپس جاکر بنگال جانے والے مہاجرین کے کسی قافلے میں شامل جاؤ۔"

میں نے مزید اصرار کیا تو پادری صاحب نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور سامنے والے چوک کی طرف اشارہ کر کے بولے:

"اس چوک کے آگے ایک کھلا میدان ہے۔ اس کے پیچھے ریلوے کا پل ہے۔ تم پل کے اوپر مت جانا۔ پل کے نیچے سے گذر جانا۔ دوسری جانب ایک اور میدان آئے گا۔ اس میدان سے بھی نکل جانا۔ اس کے بعد ناریل کے درختوں والی ایک سڑک ملے گی۔ وہ سڑک تمہیں سولی پیگوڈا پہنچادے گی۔"

میں نے پادری صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ پادری صاحب مجھے دعا دے کر آگے چل دیئے۔ میں ان کے بتائے ہوئے رستوں پر چلتا ریلوے برج کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ پل کے اوپر جاپانی سٹین گنیں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ میں جلدی سے دوسری طرف ہو گیا اور کافی آگے جاکر ریلوے لائنوں پر سے گذرتا دوسری طرف جو خالی میدان تھا' وہاں نکل آیا۔ اس خالی میدان کو پار کیا

تو ایک سڑک آ گئی جس کی دونوں جانب ناریل کے اونچے اونچے چھتریوں والے درخت کھڑے تھے۔ پادری صاحب کے کہنے کے مطابق یہی سڑک سولی پیگوڈا کو جاتی تھی۔ اس سڑک کو دیکھ کر مجھے کچھ امید پیدا ہو گئی کہ اب میں زاہدہ کے بنگلے پر پہنچ جاؤں گا۔

اس سڑک نے مجھے شہر کے وسطی علاقے میں پہنچا دیا جہاں کئی عمارتیں جاپانیوں کی بمباری سے ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں۔ برمی عورتیں اور مرد ان ملبوں میں سے ضرورت کی چیزیں نکال نکال کر لے جا رہے تھے۔ یہاں مجھے جاپانیوں کا ایک مورچہ بھی نظر آیا۔ ریت کی بوریوں کے پیچھے جاپانی فوجی سٹین گنیں لگائے بیٹھے تھے۔ میں ان سے اپنے آپ کو بچاتا وہاں سے نکل گیا۔ میرا رنگ کالا نہیں تھا اور میں شکل سے ہی پنجابی لگتا تھا۔ میں نے ایک عمارت کو پہچان لیا۔ یہاں سے آگے ایک چرچ کی عمارت تھی۔ میں نے اسے بھی پہچان لیا۔

تھوڑی دیر بعد میں سپارکس سٹریٹ میں سے گذر رہا تھا جہاں اردو اخباروں کے دفتر اور پریس ہوتا تھا۔ اس جگہ پر بھی جاپانیوں کی بمباری نے تباہی مچا رکھی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ بموں کے پھٹنے سے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ میں دور سے کسی جاپانی سپاہی کو یا جاپانی فوجی گاڑی کو آتے دیکھتا تو جلدی سے کسی دیوار یا ستون کے پیچھے چھپ جاتا۔ جب یہ گاڑی نکل جاتی تو پھر آگے چل پڑتا۔

اس طرح بچتا بچاتا آخر میں ایک چوک میں نکل آیا تو سامنے سے کچھ فاصلے پر سولی پیگوڈا کا سنہری کلس دن کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب میرے دل کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ اگر زاہدہ اپنے مکان

پر نہ ملی تو میں اسے تباہ شدہ اور جاپانی فوجوں سے بھرے ہوئے رنگون شہر میں کہاں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ بس دل میں دعائیں مانگتا ہوا سولی پیگوڈا کے قریب سے گذر گیا۔ پیگوڈا کی سیڑھیوں پر دو تین عورتیں پھول بیچ رہی تھیں۔ یہ برمی عورتیں تھیں۔ ایک برمی بھکشو زعفرانی لبادے میں ملبوس پیگوڈا کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ رنگون جاپانیوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ بلکہ سارے برما پر ہی جاپان نے قبضہ کر لیا ہوا تھا۔ شہر کی فضا میں ابھی تک جلی ہوئی لکڑیوں اور بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں جب کیولری گراؤنڈ کے نزدیک پہنچا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے کسی جاپانی فوجی نے نہیں پکڑا تھا۔ کیولری گراؤنڈ والی گورا فوج کی بارکیں ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ دن کی روشنی میں دور سے مشتاق سیٹھ کا آدھے سے زیادہ مسمار شدہ بنگلہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں گراؤنڈ کی عقبی چھوٹی سی سڑک پر آ گیا۔ خاکی رنگ کا ایک جہاز آسمان پر نمودار ہوا اور سولی پیگوڈا کی طرف نکل گیا۔ یہ جاپانی فوجی جہاز تھا۔ اس کے پہلو میں بنا ہوا جاپان کے جھنڈے کا سرخ گول نشان مجھے صاف دکھائی دیا تھا۔

میں زاہدہ کے مکان کے عقبی دروازے میں سے صحن میں داخل ہو گیا۔ دل اس خیال سے تیز تیز دھڑکنے لگا کہ اگر زاہدہ اندر نہ ہوئی تو پھر اسے کہاں ڈھونڈوں گا۔ عقبی برآمدے کے قریب آیا تو مجھے بدبو محسوس ہوئی۔ راہداری میں اسی طرح آدھے مسمار شدہ بنگلے کا ملبہ پڑا تھا۔ میں ملبے کے اوپر سے گذر کر بنگلے کے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بدبو یہاں زیادہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ مشتاق سیٹھ کی بے گور و کفن پڑی لاش کی بدبو تھی۔ میں بیڈ روم میں آیا تو دیکھا کہ بیڈ روم میں زاہدہ نہیں تھی۔ پلنگ پر لاش اسی طرح

پڑی تھی۔ مگر لاش نے سڑنا شروع کر دیا تھا۔ اندر اس قدر بدبو تھی کہ مجھ سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ میں نے پھر بھی زاہدہ کو آواز دی اور پلنگ کے نیچے بھی دیکھا۔ زاہدہ وہاں نہیں تھی۔ میں بیڈ روم سے نکل کر کچن میں آ گیا۔ کچن بھی خالی پڑا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے برتن فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس بنگلے میں ابھی تک لوٹ مار نہیں کی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی چھت آدھی گری ہوئی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ زاہدہ بنگلے میں کہیں نہیں ہے تو میں سامنے والی گراؤنڈ کی طرف نکل آیا اور ایک درخت کے نیچے تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں پیدل چلنے سے بے حد تھک چکا تھا۔

مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہاں پانی کہیں نہیں تھا۔ میں اٹھ کر مکان کے اندر کچن میں گیا۔ کچن کی ٹونٹی کھولی' پانی غائب تھا۔ کونے میں ایک مٹی کی صراحی پانی سے بھری ہوئی اسی طرح پڑی تھی۔ میں نے اس میں سے پانی گلاس میں ڈال کر پیا۔ پھر کھانے کو کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ ڈبل روٹی باسی ہو گئی تھی۔ شیشے کے مرتبان میں چینی رکھی تھی۔ تھوڑی سی چینی نکال کر کھائی۔ اوپر سے مزید ایک گلاس پانی پیا اور جلدی سے مکان سے باہر نکل آیا۔ کیونکہ لاش کی بدبو سارے مکان میں پھیلی ہوئی تھی۔ واپس آ کر سامنے والی گراؤنڈ میں درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ زاہدہ کہاں چلی گئی ہو گی۔ کبھی سوچتا کہ وہ پہلے سے یہاں رہ رہی تھی۔ یہاں اس کی جاننے والی فیملیاں بھی رہتی ہیں۔ ان میں پنجابی فیملیاں بھی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کے گھر چلی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں سے اپنے گھر آئی ہو مگر خاوند کی لاش کی بدبو نے اسے یہاں بیٹھنے نہ دیا ہو۔ کبھی خیال آتا تھا کہ وہ رات کے وقت قصبے سے نکلی تھی۔ کہیں راستے میں اسے کسی جاپانی نے نہ پکڑ لیا ہو۔ کسی بڑے

غنڈے بدمعاش کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو۔ ذہن اس قسم کے خیال سوچ کر پریشان ہونے لگا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا کروں؟ کہاں تلاش کروں زاہدہ کو؟ کیا واپس چلا جاؤں؟ مگر زاہدہ کے لئے میں سات سمندر پار کر کے یہاں آیا تھا۔ اب اسے لاپتہ چھوڑ کر کیسے واپس جا سکتا تھا۔ یہ میری محبت کو گوارا نہ تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر زاہدہ مجھے نہ ملی تو میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اگرچہ یہ جذباتی بات تھی مگر اس وقت یہ بہت بڑی حقیقت تھی۔ یہ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مجھے جذباتی بات محسوس ہو رہی ہے۔ اس وقت تو میں زاہدہ کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میرا خون کھول اٹھتا کہ اسے جاپانیوں نے پکڑ لیا ہو گا اور اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کر رہے ہوں گے۔ جاپانیوں کے بارے میں یہ مشہور ہو چکا تھا کہ وہ عورتوں خاص طور پر جوان لڑکیوں کو گھر سے نکال کر لے جاتے ہیں اور انہیں بارکوں میں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ سنگاپور' بنکاک اور جاوا سماٹرا سے یہ وحشیانہ خبریں جاپانیوں کی آمد سے پہلے ہی رنگون میں پھیل چکی تھیں۔ رنگون سے ہندوستانی کنبوں کے فوری انخلاء اور بنگال کی طرف قافلوں کی شکل میں چل پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگ اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی عزت محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں جنگلوں میں مر جانا گوارا تھا مگر وہ اپنی عورتوں کو جاپانیوں کی درندگی کا شکار ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں گراؤنڈ میں جنگلے کے ساتھ ساتھ گھاس پر جا رہا تھا۔ اور بڑی سڑک پر سے ایک دو گاڑیاں گزریں۔ ایک گھوڑا گاڑی بھی گزری۔ دو تین

جاپانی فوج کے ٹرک بھی گزرے۔ میں سوچ رہا تھا کہ زاہدہ کو کہاں تلاش کروں۔ رنگون میں ایک بھی ہندوستانی فیملی نہیں رہتی تھی۔ سب لوگ رنگون چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گئے تھے اور بے خانماں قافلوں کی شکل میں کاکسنز بازار کی طرف چل پڑے تھے۔ مجھے مغل سٹریٹ والے اقبال صاحب کا خیال آگیا۔ ان کی وہاں فرنیچر کی دکان تھی۔ وہ رنگون میں بڑے پرانے رہنے والے تھے۔ خیال آیا کہ وہ شاید رنگون سے نہ بھاگے ہوں۔ شاید وہ وہیں ہوں۔ ایک طرح سے رنگون میں امن و امان ہو چکا تھا۔ اگرچہ جاپانیوں کی پکڑ دھکڑ ضرور جاری ہوگی۔ برمی بھی مخبری کر رہے ہوں گے اور جاپانی انگریزوں کے خفیہ اسلحہ خانوں وغیرہ کا سراغ لگانے کے لئے ہندوستانیوں اور خاص طور پر پنجابیوں کو پکڑ رہے ہوں گے۔ لیکن بظاہر شہر میں کوئی گڑبڑ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مقامی برمی لوگوں نے بھی لگتا تھا، جتنی لوٹ مار کرنا تھی کر چکے تھے۔ اب انہیں لوٹ مار کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پنجابی، سورتی گجراتی اور میمن لوگ اپنی بھری ہوئی دکانیں اور مارکیٹیں کھلی چھوڑ کر، مکان کھلے چھوڑ کر رنگون سے بھاگ گئے تھے اور برمی ان پر قابض ہو چکے تھے۔

مجھے ڈر تھا تو صرف اس بات کا کہ میرا رنگ کھلتا ہوا سفیدی مائل تھا اور میں شکل سے پنجابی لگتا تھا۔ اگر کسی جاپانی فوجی نے مجھے پکڑ لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی تو میں اس کو خاطر خواہ جواب نہیں دے سکوں گا۔ اسے فوراً یہ معلوم ہو جائیگا کہ میں پنجابی ہوں اور رنگون میں انگریزوں کی جاسوسی کرنے کے لئے واپس آگیا ہوں یا یہاں سے نکلا ہی نہیں۔ انہی پریشان کر دینے والے خیالوں میں الجھا ہوا میں سولی پگوڈا کی پچھلی سٹریٹ سے ہوتا ہوا ایک چھوٹی سٹریٹ میں آگیا۔ یہ سارا علاقہ میرا جانا پہچانا تھا۔ مجھے کسی سے پوچھنے کی

ضرورت نہیں تھی۔ سٹریٹ میں آمنے سامنے غریبانہ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ یہاں بمباری نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ یہ علاقہ برمیوں کے مقدس مذہبی مقام اور رنگون کے سب سے بڑے مقدس معبد سولی پیگوڈا کے قرب و جوار میں تھا اور اس رات جاپانیوں نے ایک بھی بم یہاں نہیں گرایا تھا۔ سٹریٹ میں برمی عورتیں مکانوں کے آگے بیٹھی ہوئی سفید سگار پیتی ہوئی آپس میں تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔ کسی نے میری طرف نہ دیکھا۔

اس سٹریٹ یا گلی سے ایک اور گلی نکلتی تھی جو سیدھی مغل سٹریٹ والے چوراہے میں پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں مغل سٹریٹ والے چوراہے میں کھڑا تھا۔ یہاں اکثر دکانیں اور مارکیٹیں بند تھیں۔ کچھ دکانیں کھلی تھیں۔ یہاں ایک مارواڑی سیٹھ کی کپڑے کی دکان تھی۔ میں کبھی کبھی مشتاق سیٹھ کا کوئی پیغام لے کر سیٹھ کے پاس آیا کرتا تھا۔ اب اس دکان کے کاؤنٹر پر ایک برمی بیٹھا رجسٹر پر حساب کتاب لکھ رہا تھا۔ اسی طرح اسکاٹ مارکیٹ کی بھی ساری دکانوں پر مقامی لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں چوک میں برگد کے بڑے درخت کے سامنے ایک بنگالی ڈاکٹر کی دکان تھی اور اس کی دکان کا بورڈ فٹ پاتھ پر ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔

بازار میں لوگ آجا رہے تھے۔ یہاں ہتھ رکشے بھی چل رہے تھے۔ مگر لوگوں میں یا تو مقامی برمی لوگ تھے یا کالے رنگ کے تامل تلیگو لوگ تھے۔ جن کے بارے میں مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ کرسچین تھے۔ عیسائی ہونے کی وجہ سے برمیوں نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ وہ شروع سے ہی ان کی سیاسی تحریکوں کی حمایت کرتے آئے تھے۔ میں جامع مسجد سلطان ٹیپو کی پچھلی

دیوار کے قریب سے نکل کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ اقبال صاحب کی فرنیچر کی دکان بند تھی۔ دکان کے اوپر بورڈ بھی اسی طرح لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اقبال صاحب بھی اپنے کنبے کو لے کر رنگون سے فرار ہو گئے ہیں ۔مایوس اور پریشان ذہن کے ساتھ میں ان کی دکان والے فٹ پاتھ پر آ گیا۔ ان کی دکان کے پہلو میں ایک چھوٹی سی گلی ہوا کرتی تھی۔ اس گلی میں سے اقبال صاحب کے اوپر والے مکان کو راستہ جاتا تھا۔ میں جب دکان کے آگے سے ہو کر گلی کے سامنے سے گزرا تو میری نگاہ گلی کی طرف اٹھ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اقبال صاحب کھڑے سگار پی رہے ہیں۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں جلدی سے گلی میں داخل ہو گیا۔ اقبال صاحب کی شیو تھوڑی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی پہلے سے کمزور ہو گیا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ حیران ہو کر بولے۔

"میاں تم یہاں کہاں پھر رہے ہو' مشتاق سیٹھ کی فیملی تو نکل گئی ہے ناں؟"

میں نے کہا:۔

"سیٹھ صاحب کے بنگلے پر بم گرا تھا۔ وہ زندہ نہیں بچے۔"

"ارے!" اقبال صاحب افسوس کے لہجے میں بولے۔ "اور ان کی بیگم کہاں ہیں؟"

میں نے گلی میں کھڑے کھڑے انہیں مختصر لفظوں میں ساری داستان سنا دی۔ وہ مجھے اوپر لے گئے۔ کمرے میں بٹھایا۔ آپ میرے سامنے بیٹھ گئے۔

"تو سیٹھ مشتاق کی لاش ابھی تک ان کے گھر پر پڑی ہے؟"

میں نے کہا:۔

"جی ہاں۔ انہیں ہم کہاں دفن کرتے۔ بیگم صاحبہ خود غم سے نڈھال تھیں۔ ہر طرف آگ لگی تھی۔ جاپانی طیارے بم برساتے رہے۔ میں تو بڑی مشکل سے انہیں ساتھ لے کر رنگون سے نکل گیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ کو یہ غم کھائے جارہا تھا کہ وہ اپنے خاوند کی لاش کو گھر پر چھوڑ آئی ہیں۔ قیامت کے دن اسے کیا جواب دیں گی۔ چنانچہ رات کو کسی وقت وہ پیانگ سو قصبے کی غار میں سے نکل گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ رنگون گئی ہیں۔ چنانچہ میں جمیل صاحب کی فیملی سے الگ ہو کر رنگون بیگم صاحبہ کی تلاش میں آگیا ہوں۔ یہاں جو کچھ میں نے دیکھا وہ آپ کو بتا چکا ہوں"۔

اقبال صاحب بولے۔

"میاں! رنگون پر تو قیامت گزر گئی ہے' میں نے تو اپنی فیملی کو ایک قافلے کے ساتھ بنگال کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ برما کے جنگلوں سے نکل کر بنگال پہنچیں گے بھی یا نہیں۔ ویسے میرا بھائی اور اسکی فیملی ساتھ ہے۔ میں یہاں اکیلا رہ گیا ہوں' اس لئے کہ میرا یہاں لاکھوں کا مال پڑا ہے۔ عورتوں کو میں نے اس لئے بھجوا دیا کہ جاپانی انہیں اٹھا کر نہ لے جائیں۔ خود یہاں ٹھہر گیا ہوں کیونکہ یہاں کے مقامی لوگوں سے میرے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ میں خود سوشلسٹ ہوں اور برما کی سوشلسٹ پارٹی کا سرگرم رکن بھی رہ چکا ہوں اور انگریزوں کے خلاف جلسوں میں تقریریں بھی کرتا رہا ہوں۔ مجھے میرے برمی دوست کہتے ہیں کہ عورتوں کو ہمارے ہاں رکھوا دو۔ مگر یہاں مجھے ان برمیوں پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ اگر جاپانیوں کو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کچھ ہندوستانی عورتوں کو پناہ دے رکھی ہے تو وہ ان

سے ہماری عورتیں چھین کر لے جاتے اور میرے برمی دوستوں نے آگے سے کوئی مزاحمت نہیں کرنا تھی۔ اس لئے میں نے اپنی عورتوں کو یہاں سے بھگا دیا ہے۔ خود یہاں بیٹھا ہوں۔ دکان ابھی تک محفوظ ہے۔ مگر میں دکان کھولتا نہیں ہوں۔ اسے بند رکھتا ہوں۔"

جب میں نے اقبال صاحب کے آگے اس تشویش کا اظہار کیا کہ مجھے زاہدہ کو کہاں تلاش کرنا چاہئے تو فکر مند ہو گئے۔ سانس بھر کر بولے :۔

"میاں! مجھے مسز مشتاق سیٹھ کی بیگم کے اس طرح لاپتہ ہو جانے کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ اس شہر میں جس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں' وہ تمہارے سامنے ہیں۔ میرا ٹیلی فون کئی روز سے بند پڑا ہے۔ مگر مجھے جن گھروں میں فون کر کے بیگم مشتاق کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا' وہ گھر تو اب خالی ہو چکے ہیں۔ مانڈلے میں مشتاق سیٹھ کے ایک دوست کی فیملی رہتی تھی۔ مگر مسز مشتاق راتوں رات اتنی دور مانڈلے نہیں پہنچ سکتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اقبال صاحب بولے۔

"تم نے صبح ناشتہ کیا تھا؟ اب تو کافی دوپہر ہو گئی ہے۔ میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔"

وہ اٹھے اور مکان کے کچن کی طرف چل دیئے۔ میں وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا کر زاہدہ کے خیالوں میں ڈوب سا گیا۔ میرے دل کا ذرہ ذرہ زاہدہ کے حق میں اللہ میاں سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا پاک پروردگار زاہدہ کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ اسے جاپانی سپاہیوں سے بچا لینا۔

اقبال صاحب چاول اور سبزی پکی ہوئی لے آئے۔ کہنے لگے۔

"نوکر بھی بھاگ گئے ہیں۔ ابھی تک تو میں صبح اٹھ کر خود ہی کھانا تیار کر کے رکھ لیتا ہوں۔"

کھانے کے بعد میں نے غسل کیا۔ اقبال صاحب نے مجھے نئے کپڑے پہننے کو دیئے۔ ان کی ایک ٹھنڈی پتلون تھی جو سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ہوئی تھی۔ ایک بش شرٹ دی جو مجھے ذرا لمبی تھی مگر میں نے پہن لی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس کچھ روپے ہیں جو میں نے کمر کے ساتھ باندھ رکھے ہیں۔ اقبال صاحب کہنے لگے :۔

"انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔ کوئی پتہ نہیں کل یہاں کیسے حالات بن جائیں۔ ہو سکتا ہے انگریز جوابی حملہ کریں۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ جوابی حملہ ضرور کریں گے۔ رات میں نے بی بی سی کا ریڈیو سنا تھا۔ یہاں بی بی سی ریڈیو سننے کی اجازت نہیں ہے مگر میں نے چھپ کر سن لیا تھا۔ بی بی سی پر کوئی انگریز فوجی برما فرنٹ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ برما فرنٹ پر برٹش فوج کا دفاع نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر برٹش انڈیا کی رجمنٹوں کے ساتھ ہم جوابی کارروائی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور ہمیں اعلانیہ طور پر ایسا کرنا چاہیے۔ برما اگر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو انڈیا بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گا اور یہ ایسا نقصان ہو گا جو کوئی انگریز بھی برداشت نہیں کر سکے گا"۔

میں زاہدہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے بی بی سی کے تبصرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اقبال صاحب نے اپنی بات ختم کی تو میں نے پوچھا :

"آپ کے خیال میں اس شہر میں کوئی ایسا آدمی ہے جو ہمیں یہ بتا سکے کہ شہر میں کوئی پنجابی فیملی موجود ہے یا نہیں؟"

اقبال صاحب سوچ کر کہنے لگے۔

"ایک بات ہو سکتی ہے۔ میں اپنے برمی سوشلسٹ دوستوں سے یہ معلوم کروا سکتا ہوں۔"

میں نے ان کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز یہ آج ہی پتہ کروا دیں۔ میرا دل کہتا ہے مسز مشتاق نے ضرور کسی پنجابی فیملی میں پناہ لے رکھی ہے۔"

اقبال صاحب بولے:۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں شام ہونے سے پہلے پہلے ساری معلومات حاصل کر لوں گا۔ اب تم آرام کرو۔ میں نیچے دکان میں جاتا ہوں۔ کچھ ضروری حساب کتاب دیکھنا ہے۔ ویسے دکان کو باہر سے تالا لگا ہو گا۔ میں گلی والے دروازے سے جاؤں گا۔"

اقبال صاحب نیچے اتر گئے۔ میں وہیں صوفے پر دراز ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ کئی بار اس خیال سے آنکھیں بند کیں کہ شاید نیند آجائے۔ مگر زاہدہ کی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔ اور نیند غائب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کے بعد اقبال صاحب اوپر آگئے اور کہنے لگے:۔

"میاں تم سوئے نہیں؟"

میں نے صوفے پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے یونہی کہہ دیا کہ تھوڑی دیر کو سو گیا تھا۔ اقبال صاحب الماری کھول کر پرانے کپڑوں میں سے کچھ تلاش کرتے ہوئے بولے:۔

"میاں! جاپانیوں نے رنگون کے سارے بنکوں میں سے دولت نکال کر جاپان پہنچا دی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ زیادہ دیر تک یہاں قبضہ برقرار

برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ مجھے میرے برمی دوستوں نے بتایا ہے کہ وہ انسن کے ریلوے ورکشاپ میں سے بھاری مشینری بھی اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ اس پر برما کے لوگ جاپانیوں کے خلاف بھی ہو گئے ہیں۔ مگر وہ ان کے آگے بول نہیں سکتے۔ تمہیں معلوم ہے؟ جاپانی رنگون شہر کے ہندوستانی عورتوں کے علاوہ کئی برمی لڑکیاں بھی اٹھا کر لے گئے ہیں جو سول سیکریٹریٹ میں کام کیا کرتی تھیں۔ برمیوں کو اب اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا ہے کہ انہوں نے جاپانیوں کی مدد کر کے غلطی کی ہے۔"

پھر اقبال صاحب نے الماری میں سے ایک نیلے رنگ کا ریشمی رومال نکالا اور اسے اپنے سر پر بالکل اسی طرح باندھ لیا جس طرح برمی لوگ باندھا کرتے ہیں۔ میری طرف دیکھ کر کہا:۔

"میں اپنے برمی سوشلسٹ دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ اپنی حفاظت کے خیال سے اس طرح رومال سر پر باندھ کر نکلتا ہوں۔ تم یہیں رہنا۔ میں مکان کو نیچے تالا لگا کر جاؤں گا۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہاں پندرہ نمبر سٹریٹ تک ہی جانا ہے"۔

اقبال صاحب نیچے سیڑھیوں والے دروازے پر باہر سے تالا لگا کر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر زاہدہ کے خیالوں میں الجھ گیا۔ اٹھ کر کچن میں گیا۔ کچن میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا تھا۔ پرانے ٹائپ کا کچن تھا۔ مجھے ایک جگہ سگاروں کا ڈبہ پڑا نظر آیا۔ اس میں سے ایک سگار نکال کر میں نے سلگایا تو ایکدم کھانسی شروع ہو گئی۔ سگار بڑا سخت اور تیز تھا۔ مجھے سگار کی عادت بھی نہیں تھی۔ جلدی سے پانی پیا تو طبیعت بحال ہوئی۔ واپس چھوٹے کمرے کے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور اقبال صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ انہوں نے کافی دیر

لگادی۔ میں فلیٹ سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ اسی کمرے میں کبھی صوفے پر لیٹ جاتا۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اقبال صاحب دوپہر کے گئے شام پڑے واپس آئے۔ سر پر پڑا ہوا برمی رومال کھول کر پلنگ پر پھینکا اور بولے:

"میاں کچھ لڑکیوں کا سراغ ملا ہے جنہیں جاپانیوں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ مسز مشتاق ان لڑکیوں میں ہے یا نہیں ہے"

میں اقبال صاحب کی طرف تک رہا تھا۔ جو کچھ میں پوچھنا چاہتا تھا' وہ میرے چہرے سے ظاہر تھا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کہ زاہدہ ان لڑکیوں میں نہ ہو۔ اقبال صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ سگار سلگایا اور کہنے لگے:۔

"نی ون میرا دوست ہے۔ میں اسی کے پاس گیا تھا۔ وہ یہاں کسی سوشلسٹ پارٹی کا سیکریٹری بھی ہے۔ وہ قابل اعتبار دوست ہے۔ میں نے اس کے آگے ساری بات کھول کر بیان کر دی تھی۔ اس نے اسی وقت اپنے ایک اور دوست کو بلوا لیا۔ یہ برمی نوجوان تھا اور پارٹی کا بڑا جوشیلا ورکر تھا۔ اسکا نام تھاون تھا۔ اس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ رنگون کے باہر دریائے ایراوتی کے کنارے جاپانیوں نے خاردار باڑھ لگا کر ایک بنگلے کو فوجی گیریژن میں تبدیل کر لیا ہے۔ یہ کافی بڑا دو منزلہ بنگلہ ہے۔ ایک جاپانی کیپٹن اس گیریژن کا انچارج ہے۔ یہاں انہوں نے کچھ لڑکیاں رنگون سے پکڑ کر قید کر رکھی ہیں۔ ان میں سکھ اور ہندو لڑکیاں ہیں۔ کسی مسلمان لڑکی کا اسے علم نہیں ہے۔ لیکن اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پتہ کرے گا کہ جاپانیوں کے گیریژن میں اگر کوئی مسلمان عورت ہے تو اسکا نام کیا ہے اور حلیہ کیا ہے"

میں تو اپنے دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ زاہدہ ان لڑکیوں میں سے نہ ہو۔ اس تصور ہی سے میرا ذہن پھٹنے لگتا کہ زاہدہ جاپانی فوج کی قید میں ہے اور اس کے ساتھ درندوں والا سلوک ہو رہا ہے۔ میں نے کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ زاہدہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوگی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو"

اقبال صاحب نے اپنی بھنویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو بہت کچھ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خدا جانے ان سکھ اور ہندو لڑکیوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ جس وقت زاہدہ وہاں سے چلی تھی تو سارے علاقے پر جاپانی فوج کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ کسی جاپانی سپاہی کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ بہرحال کل تک پتہ چل جائے گا"

وہ رات میں نے اقبال صاحب کے فلیٹ پر بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری۔ صبح جب اقبال صاحب نماز پڑھنے کے لئے اٹھے تو میں جاگ رہا تھا۔ ناشتہ ہم دونوں نے مل کر کیا۔ مجھے زاہدہ کے خاوند کا خیال آگیا۔ میں نے اقبال صاحب سے کہا:۔

"مشتاق سیٹھ کی لاش کیا وہاں ان کے بنگلے میں ہی پڑی رہے گی؟"

وہ بولے:۔

"رنگون میں کئی لاشیں اسی طرح پڑی ہیں' اب ہم تو وہاں جا کر اسے دفنانے سے رہے"

میں نے آگے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ زاہدہ کے بارے میں' میں نے رات کو سوچا تھا کہ میں کیوں نہ واپس مسز جمیل کے ٹھیکیدار دولت کے مکان پر چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ زاہدہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد

وہیں واپس پہنچ گئی ہو۔ جب میں نے اس خیال کا اظہار اقبال صاحب سے کیا تو وہ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولے۔

"میاں! پہلے گیریژن والی لڑکیوں کا پتہ کر لینے دو۔ اگر مسز مشتاق ان میں نہ ہوئی تو پھر جہاں جی چاہے چلے جانا۔ لیکن ایک بات میں تمہیں ضرور کہوں گا یہاں تمہارا کھلے بندوں پھرنا خطرناک ہو گا۔ کسی جاپانی فوجی سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ جاسوس سمجھ کر تمہیں ضرور پکڑ لے گا۔ میرے برمی دوست نی ون نے مجھے بتایا تھا کہ جاپانیوں نے کئی پنجابیوں کو پکڑ لیا تھا اور ان پر اسقدر تشدد کیا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہا۔"

ناشتے کے بعد اقبال صاحب اپنے برمی دوست کے بعد زاہدہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے واسطے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"مسز مشتاق کا کچھ پتہ چلا پھر؟"۔

اقبال صاحب پلنگ پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"میاں اتنا پتہ چلا ہے کہ جو پنجابی لڑکیاں جاپانیوں کی قید میں ہیں' ان میں ایک مسلمان لڑکی بھی ہے۔ ہندو سکھ لڑکیاں تو گیریژن کے باغ میں ادھر ادھر چل پھر بھی لیتی ہیں لیکن یہ مسلمان پنجابی لڑکی دوسری منزل کے چھوٹے سے کمرے میں ہی رہتی ہے"۔

"اسکا نام نہیں معلوم ہو سکا کیا؟"۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ڈرتے ڈرتے اس لئے پوچھا کہ کہیں آگے سے اقبال صاحب یہ نہ کہہ دیں کہ ہاں نام معلوم ہو گیا ہے۔ اسکا نام زاہدہ ہے۔ اقبال صاحب بولے:۔

"میاں! ان لڑکیوں کے پاس کسی باہر کے آدمی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ نام کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اب تو یہی ایک طریقہ ہم نے سوچا ہے کہ تم خود گیریژن میں جاکر اس مسلمان لڑکی کو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مسز مشتاق ہو"

میں نے کہا:۔

"لیکن میں جاپانی فوج کے گیریژن میں کیسے جا سکتا ہوں"۔

اقبال صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میاں تم ہمیں کیا سمجھتے ہو؟ ہم نے اسکا بھی انتظام کر لیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جاپانی کیپٹن جو گیریژن کا انچارج ہے' عمارت میں رنگ و روغن کروا رہا ہے۔ اسکا ٹھیکہ میرے برمی سوشلسٹ دوست نی ون نے ہی لے رکھا ہے۔ جاپانی کیپٹن کو بھی کسی دوسرے برمی پر اعتبار نہیں تھا۔ کیونکہ جاپانیوں کو بھی معلوم ہو گیا ہوا ہے کہ برما کے مقامی لوگ اب جاپانیوں سے اتنے خوش نہیں ہیں۔ مگر نی ون پر جاپانی کیپٹن کو پورا بھروسہ ہے۔ نی ون نے وہاں اپنے کچھ کاریگر لگا رکھے ہیں۔ جو صبح سے شام تک اس کی نگرانی میں عمارت کی دونوں منزلوں میں رنگ و روغن کرتے ہیں۔ تم ایک کاریگر بن کر ان کے ساتھ گیریژن میں جاؤ گے اور یہ معلوم کرو گے کہ قیدی لڑکیوں میں مسز مشتاق ہیں یا نہیں۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اقبال صاحب بولے :۔

"میاں ! کام خطرناک ہے۔ جاپانیوں کو تم پر ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ تمہیں اسی وقت شوٹ کر دیں گے"

میں نے کہا۔

"میں یہ خطرہ مول لینے پر تیار ہوں"۔

اقبال صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"میاں! مسز مشتاق کے لئے تم اپنی جان خطرے میں کس لئے ڈال رہے ہو؟ کیا تمہاری اس سے کوئی رشتہ داری ہے؟"

میں نے فوراً کہا :۔

"جی ہاں! میں نے آپ کو بتایا نہیں ۔ مسز مشتاق میری خالہ زاد ہیں"

اقبال صاحب بولے :۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔ اب ایسا ہے کہ میں نے آج رات اپنے برمی دوست نی ون کو یہاں بلایا ہے۔ وہ ساری تفصیل تمہیں خود بتائے گا کہ تمہیں کس طرح جاپانیوں کے گیریژن میں داخل ہونا ہو گا"۔

اس کے بعد اقبال صاحب نیچے بند دکان میں حساب کتاب لکھنے کے لئے چلے گئے۔ دوپہر کو انہوں نے بازار سے کھانا منگوا لیا' جو ہم نے کمرے میں بیٹھ کر کھایا۔

جب رات ہو گئی تو اقبال صاحب کا برمی دوست نی ون آ گیا۔ درمیانی عمر کا عام برمی آدمی تھا۔ سر پر زرد رومال باندھا تھا۔ دھوتی کی بجائے

اس نے کھدر کی بش شرٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستانی زبان بڑی اچھی طرح سے بول لیتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اقبال صاحب نے اسے بتایا کہ میں اس کے ساتھ گیریژن میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ نی ون میری طرف دیکھ کر بولا:۔

"میرے ساتھ روزانہ چھ کاریگر گیریژن میں جاتے ہیں۔ ان میں پانچ برمی ہیں۔ صرف ایک کاریگر مراٹھی ہے۔ کل صبح میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارا نام کریم بھائی ہو گا۔ تم یہی کہنا کہ آگرہ شہر کے رہنے والے ہو۔ ملازمت کی تلاش میں رنگون آئے تھے اور یہاں سے واپس آگرہ نہیں جا سکے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ مگر خبردار وہاں کسی سے پنجابی زبان میں بات نہ کرنا۔ نہیں تو تمہارے ساتھ مجھ پر بھی مصیبت نازل ہو سکتی ہے"۔

میں نے کہا:۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں اردو بڑی اچھی طرح سے بول لیتا ہوں۔ پنجابی زبان کو میں بھول جاؤں گا"۔

"جاپانی کیپٹن کا نام اوکیڈا ہے اور وہ اردو زبان بول لیتا ہے۔ اس کے آگے زیادہ بات مت کرنا"۔

میں نے کہا:۔

"آپ جس طرح کہیں گے، میں ویسے ہی کروں گا"۔

نی ون کہنے لگا۔

"وہاں جو لڑکیاں جاپانیوں نے اپنی قید میں رکھی ہوئی ہیں، ان میں صرف یہی مسلمان ایک ایسی لڑکی ہے جو دوسری منزل کے کمرے میں بیٹھی

رہتی ہے۔ باقی جو سکھ اور ہندو لڑکیاں ہیں انہوں نے اپنی بد قسمتی کو قبول کر لیا ہوا ہے اور وہ جاپانیوں کے ساتھ خوش رہتی ہیں اور گیریژن کے پلاٹ میں بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ تم کل صبح تیار رہنا۔ میں نو بجے تمہیں لینے آ جاؤں گا"۔

اس کے بعد کچھ دیر تک نی ون اقبال صاحب سے جاپانیوں کے رنگون پر قبضے اور آسام کے محاذ پر برطانوی ہند کی فوجوں کے ایڈوانس کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد اقبال صاحب نے مجھے مزید سمجھایا کہ وہاں جاؤ گے تو جاپانیوں کو دیکھ کر ڈر نہ جانا۔ اردو میں بات کرنا۔ کسی سے بھی پنجابی میں بات مت کرنا۔ اگر مسز مشتاق وہاں ہوئی تو اس کے قریب بھی نہ جانا۔ کہیں تمہیں دیکھ وہ بے اختیار پنجابی میں تمہیں پکار نہ بیٹھے۔ پھر سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میرے دوست نی ون کا اعتماد بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور جاپانی اسے انگریزوں کا جاسوس سمجھ کر گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔

دوسرے دن نو بجے میں اقبال صاحب کی دکان پر بالکل تیار بیٹھا تھا۔ نی ون نو بجے ٹھیک وقت پر آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ میرے لئے ایک نیلی بش شرٹ اور اسی رنگ کی ایک پرانی پتلون بھی لایا تھا۔ یہ وہاں رنگ و روغن کرنے والے برمی مزدوروں کا لباس تھا۔ میں نے وہیں نیلی بش شرٹ اور پتلون پہن لی۔ سر پر نیلے رنگ کی ٹوپی بھی پہن لی۔ نی ون نے ایک بار پھر مجھے اردو زبان میں اچھی طرح سمجھایا کہ مجھے جاپانی کیپٹن کے سامنے کیا کیا بات کرنی ہے۔ وہ ایک بند جیپ میں آیا تھا۔ ہم دونوں نیچے بازار میں آ کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ رنگون کے بازاروں میں سے گزرنے لگی۔ نی ون نے کہا:۔

"باقی کے مزدور وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ میں نے تمہارے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا ہے وہ اپنے آدمی ہیں۔ ان میں صرف ایک مرہٹہ ہے باقی سب برمی ہیں۔ مرہٹہ بھی رنگون میں پیدا ہوا تھا اور ہماری پارٹی کا ممبر ہے"۔

باتوں باتوں میں جیپ رنگون کے گنجان علاقے سے نکل کر دریا کی طرف جانے والی کشادہ سڑک پر آگئی۔ یہ سڑک میری دیکھی بھالی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد رنگون کے مشہور دریا' ایراوتی کا کنارہ شروع ہو گیا۔ دریا کی جانب سے آنے والی مرطوب ہوا کے جھونکے محسوس ہونے لگے۔ ابھی دریا نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک جانب اونچی اونچی عمارتیں تھیں' جن میں سے اکثر عمارتوں پر جاپانی پرچم لہرا رہے تھے۔ پھر یہ عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور جیپ اونچی نیچی سڑکوں پر سے گزرتی ایک غیر آباد علاقے میں سے گزرنے لگی۔ یہ علاقہ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دریا ہمارے بائیں جانب تھا۔ درختوں کے درمیان میں سے کسی کسی وقت دریا کا پاٹ دکھائی دے جاتا تھا۔ میں نے یہ بات اچھی طرح سے نوٹ کر لی کہ یہاں دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا اور دوسرے کنارے کے درخت صاف نظر آرہے تھے۔ پھر خار دار باڑ کی دس بارہ فٹ اونچی دیوار شروع ہو گئی۔ نی ون نے کہا۔

"یہی جاپانیوں کا فوجی گیریژن ہے۔"

گیریژن کے گیٹ پر جیپ رک گئی۔

دو جاپانی سپاہی پہرے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے نی ون کا کارڈ دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر ایک جاپانی سپاہی نے نی ون سے ہندوستانی میں میرے بارے میں پوچھا۔ نی ون نے کہا کہ یہ نیا مزدور ہے۔ کام زیادہ ہے۔ نیا مزدور لگایا ہے۔ یہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے۔ جاپانی سپاہی نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ گیٹ کے آگے ایک ہرا بھرا پلاٹ تھا۔ آگے دو منزلہ عمارت تھی۔ برآمدے میں چھوٹے سے گول دائرے کے اندر جاپانی پرچم لہرا رہا تھا۔ ایک طرف کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چھ سات جاپانی سپاہی کوئیک مارچ کرتے آگے سے گزر گئے۔ نی ون مجھے لے کر جاپانی کمانڈو کیپٹن اوکیڈا کے کمرے میں آ گیا۔ نی ون نے اسے سلام کیا۔ میں بھی سلام کر کے دیوار کے ساتھ بالکل سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جاپانی کمانڈر اوکیڈا نے مجھے غور سے دیکھا اور نی ون سے مسکرا کر پوچھا:۔

"یہ نیا آدمی کون ہے؟"

نی ون نے کہا۔

" سر! نیا مزدور لایا ہوں۔ کام زیادہ ہے۔ آدمی کم پڑ گیا ہے۔ یہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے۔ آگرہ کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ کانگریسی تھا اور سوبھاش بابو کے ساتھ انگریزوں کے خلاف بنگال میں مہم چلاتا رہا ہے۔"

جاپانی کمانڈر کے چہرے پر ایک ایسی پتلی سی مسکراہٹ تھی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے یا سنجیدہ ہے۔ لگتا تھا کہ یہ مسکراہٹ کسی وقت بھی غائب ہو سکتی ہے۔ وہ برابر مجھے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اسکی تیز نگاہیں اپنے بدن پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں مگر میں بڑی ہمت کر کے بے نیازی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور احمقوں کی طرح مسکراتا رہا۔ جاپانی کمانڈر نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے"۔

جیسا کہ نی ون نے مجھے پہلے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا:۔

" سر! میرا نام فیروز علی ہے"

"ہوں"

یہ کہہ کر جاپانی کمانڈر نے اپنا بید دو تین بار آہستہ آہستہ میز پر بجایا اور نی ون کی طرف دیکھ کر بولا۔

"نی ون! فیروز علی کا شناختی کارڈ آج ہی بنوا لو۔ میں چاہتا ہوں کام چار پانچ دنوں میں ختم ہو جائے۔ سنگاپور سے ہمارا ڈویژن کمانڈر آنے والا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے رنگ روغن کا کام پورا ہو جانا چاہیے"۔

نی ون نے کہا۔

"سر! مجھے صرف دس دن دے دیں اسی لئے میں ایک اور آدمی ساتھ لایا ہوں۔ دس دنوں میں بلڈنگ کی دونوں منزلوں پر رنگ روغن ختم ہو جائے گا"۔

"اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گا"۔

جاپانی کمانڈر نے بید میز پر مار کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ نی ون نی سلام کر کے کہا۔

"نہیں لگے گا سر!"

اور وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہاں سے ہم اس دو منزلہ عمارت کی پہلی منزل کے برآمدے میں سے ہوتے ہوئے کونے والے کمرے میں آئے جہاں پہلے سے چار مزدور دیواروں پر رنگ کر رہے تھے۔ سیڑھیاں لگی تھیں۔ مجھے رنگ و روغن کرنا نہیں آتا تھا اور نی ون مجھے کسی خاص مقصد کے لایا تھا جس سے برما کی سوشلسٹ پارٹی کا کوئی گہرا مفاد وابستہ تھا۔ نی ون نے انہیں یہ بالکل نہیں بتایا تھا کہ میں مسز مشتاق کی شناخت کرنے آیا ہوں۔ وہ سب برمی تھے۔ مرہٹہ مزدور وہاں نہیں تھا۔ وہ کسی دوسری طرف کام کر رہا تھا۔ یہ برمی مزدور سارے پارٹی کے آدمی تھے مگر رنگ و روغن کا کام بخوبی جانتے تھے۔ ایک کاریگر نے میرے ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ اور برش تھما دیا اور کہا:

"اس دیوار پر رنگ کرنا شروع کر دو۔ کوئی فکر نہ کرو۔ تم ویسے ہی رنگ پھیرتے جاؤ۔ ہم بعد میں ٹھیک کر لیں گے۔"

یہ کاریگر برمی تھا مگر صرف اردو بول لیتا تھا۔ پھر وہ میرے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا۔

"یہاں سارے کاریگر اپنے آدمی ہیں۔ تم نے جس لڑکی کو شناخت کرنا ہے' وہ دوسری منزل میں کونے والے کمرے میں ہے۔ تھوڑی دیر یہاں دیوار پر روغن کرو' پھر میں تمہیں اپنے ساتھ اوپر لے جاؤں گا۔ تم لڑکی کو شناخت کر لینا۔"

نی ون جا چکا تھا۔ مجھے روغن کرنا تو نہیں آتا تھا۔ مگر دوسروں کو دیکھ کر میں نے بھی دیوار پر برش چلانا شروع کر دیا۔ جاپانی سپاہی کمرے میں آیا۔ دیواروں کو غور سے دیکھا اور پھر جس برمی کاریگر نے مجھے کام پر لگایا تھا' اس کو کام جلدی نمٹانے کی تاکید کر کے واپس چلا گیا۔ جاپانی سپاہی عجیب و غریب قسم کی اردو بول رہا تھا جو میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد برمی کاریگر سیڑھی پر سے اتر کر میرے پاس آیا اور رازداری سے کہا۔

"میرے ساتھ اوپر آؤ۔ ڈبہ برش اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا۔ اوپر اس وقت صرف ایک لڑکی بیٹھی ہے۔"

میں برمی کاریگر کے ساتھ رنگ و روغن کا سامان اٹھا کر اوپر والی منزل میں آ گیا۔ اوپر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ یہاں بھی ایک جاپانی سپاہی کونے میں پہرہ دے رہا تھا۔ وہ سٹول پر بیٹھا تھا۔ ہم اس کے قریب سے گزر گئے۔ برآمدے میں سب سے آخر میں ایک کمرہ تھا جس کے باہر بھی سیڑھی لگی تھی اور ایک برمی کاریگر رنگ کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جیسے ہی میں اپنے ساتھی برمی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا' مجھے سامنے کونے میں ایک پرانے صوفے پر زاہدہ بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اداس نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ برمی کاریگر نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ میں دو قدم چل کر زاہدہ کے قریب گیا تو اس نے

پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ صوفے سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہیں سمٹ گئی۔ اس کا چہرہ کمزور ہو گیا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ برمی کاریگر نے سیڑھی دیوار کے ساتھ لگا دی اور میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کی تمہیں تلاش تھی؟۔ میں نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے جواب دیا کہ ہاں یہ وہی لڑکی ہے۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ باہر آجاؤ۔ کمرے میں صرف ایک ہی دیوار تھی، جس پر رنگ کرنا باقی رہ گیا تھا۔ وہاں ایک آدمی پہلے سے کام کر رہا تھا۔ میں برآمدے میں آ گیا اور میرے دوست برمی کاریگر نے مجھے اپنے ساتھ برآمدے کی دیوار پر کام پر لگا دیا۔ میں کام کرتے کرتے سیڑھی ادھر ادھر کرنے کے بہانے کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا اور اندر نگاہ ڈال کر زاہدہ کو دیکھا۔ وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسلسل دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی تلاش میں جاپانیوں کے کیمپ میں پہنچ سکتا ہوں۔

میں زاہدہ سے بات کرنے کو بے چین تھا۔ میں کام کرتے کرتے اپنے برمی دوست کاریگر کے پاس پہنچ گیا اور اسے دبی زبان میں کہا کہ میں اس لڑکی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ برمی کاریگر نے نفی میں سر ہلایا اور اونچی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"آجاؤ نیچے۔ یہاں زیادہ کام نہیں ہے۔"

میں اس کے ساتھ روغن کا ڈبہ اور برش اٹھائے دروازے کے سامنے سے گزرا اور نگاہ ڈال کر اندر دیکھا۔ زاہدہ صوفے پر سے اٹھ کر

اب کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں باہر برآمدے میں ہوں۔ جب میں دروازے کے سامنے سے اسے دیکھتے ہوئے گزرا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آنکھوں سے اسے ایسا اشارہ کیا' جسکا مطلب تھا کہ تسلی رکھو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔ ہم نیچے گراؤنڈ فلور پر آگئے۔

میں دوسرے کاریگروں کے ساتھ سہ پہر تک وہیں کام کرتا رہا۔ اس دوران میں نے برمی دوست کو بتادیا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کو شناخت کرنے میں وہاں آیا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر جب ہم گیریژن کے گیٹ سے باہر آئے تو نی ون وہاں اپنی جیپ لئے کاریگروں کو لینے کے لئے موجود تھا۔ جب ہماری جیپ گیریژن سے تھوڑی دور چلی گئی تو نی ون نے مجھ سے زاہدہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مسز مشتاق ہی ہے۔ اس نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا۔ اقبال صاحب کے فلیٹ پر آکر نی ون نے دوسرے کاریگروں کو بھیج دیا اور خود میرے ساتھ اقبال صاحب کے فلیٹ پر آگیا۔ اقبال صاحب وہاں موجود تھے اور کچن میں چائے بنا رہے تھے۔ میری شکل دیکھتے ہی پوچھا۔

"کیوں میاں؟"

میں نے کہا۔

"میں نے مسز مشتاق کو دیکھ لیا ہے۔ وہ جاپانیوں کے پاس گیریژن میں ہی ہے۔"

اقبال صاحب نے اپنے دوست نی ون کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"نی ون! کسی کو وہاں شک تو نہیں پڑا؟"

نی ون صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"کامریڈ! شک کیسے پڑ سکتا ہے۔ یہ نوجوان تو اب ہمارا کاریگر ہے۔ اب اگر یہ چاہے تو روز ہمارے ساتھ جا سکتا ہے۔ میں نے کیپٹن اوکیڈا کو مطمئن کر دیا ہے۔"

اقبال صاحب چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولے :۔

"ارے کامریڈ! اسے اب وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم مسز مشتاق کو جاپانیوں کی قید سے رہائی نہیں دلا سکتے۔"

میں نے کہا :۔

"میں مسز مشتاق کو جاپانیوں کی قید سے نکال کر اپنے ساتھ پنجاب لے جانا چاہتا ہوں۔"

نی ون اور اقبال صاحب میرا منہ تکنے لگے۔

"ارے میاں! تم اس مصیبت میں کیوں پڑو گے؟ کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ جاپانیوں کی قید سے اس عورت کو نکالنا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہے۔ اب اسے اسکی قسمت پر چھوڑ دو۔"

اقبال صاحب یہ کہہ کر سگار سلگانے لگے۔ نی ون بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے کچھ کچھ شک پڑ گیا ہے کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اقبال صاحب سے کہا :۔

"سیٹھ جی! وہ میرے شہر کی رہنے والی ہے۔ وہ میرے سیٹھ کی بیوی ہے۔ جاپانی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اسے اذیت ناک موت سے بچانا میرا اخلاقی فرض ہے۔ میں اسے وہاں سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

اقبال صاحب نے نی ون کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"کامریڈ! یہ لڑکا تو پاگل ہو گیا ہے۔"

نی ون بولا:۔

"میرے دوست! یہ کہتا تو ٹھیک ہے۔ اگر اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔"

اقبال صاحب نے کندھے سمیٹتے ہوئے کہا:۔

"تو پھر تم ہی اسکی مدد کر سکتے ہو۔ مگر اتنا یہ ضرور ذہن میں رکھنا کہ اگر جاپانیوں کو ذرا سا بھی شبہ پڑ گیا کہ مسز مشتاق کو فرار کروانے میں تمہارا ہاتھ بھی ہے' تو پھر ہم سب کی خیر نہیں۔ یہ لڑکا تو مسز مشتاق کو لے کر لاہور پہنچ جائے گا' پیچھے ہماری خیر نہیں ہو گی۔"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ نی ون ایک دلیر برمی نوجوان ہے اور وہ ہر حالت میں میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا:۔

"سیٹھ اقبال! اسکی تم فکر نہ کرو۔ میں ایسی سکیم پر عمل کروں گا کہ جاپانیوں کے بادشاہ سلامت کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

نی ون کا یہ عزم دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا کہ میں زاہدہ کو اس جہنم سے نکال کر لے جاؤں گا۔ میں نے نی ون اور اقبال صاحب دونوں کو مخاطب ہو کر کہا:۔

"میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا اور مسز مشتاق کی اولادوں کی اولادیں بھی آپ کی احسان مند رہیں گی۔"

اقبال صاحب نی ون کی طرف دیکھ کر بولے:۔

"کامریڈ نی ون! یہ تو اپنی جگہ ٹکا ہوا ہے۔ اب تم جانو اور یہ جانے۔ میں صرف اتنی گزارش کروں گا کہ اس پورے منصوبے میں میرا کسی سے ذکر نہ کیا جائے۔ ویسے تم جیسے کہو گے' میں ویسے ہی کروں گا۔"

نی ون نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا:۔

"مجھے آج کی رات غور کرنے دو۔ کل صبح بتادوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

نی ون چلا گیا۔ اس کے بعد اقبال صاحب کہنے لگے:۔

"میاں! کیا بات ہے۔ تم مسز مشتاق کے بارے میں اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ تم بہت بڑا قدم اٹھا رہے ہو۔ ایک بار پھر غور کر لو۔ اگر پکڑے گئے تو ہم بھی پھنس سکتے ہیں۔ جاپانی تم سے سب کچھ اگلوا سکتے ہیں۔"

میں نے اقبال صاحب سے کہا:۔

"مسز مشتاق سے میرا صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ میری کزن ہے۔ اگر میں اسے یہاں اس جہنم میں چھوڑ گیا تو میرا ضمیر مجھے ساری زندگی تڑپاتا رہے گا۔ اگر مسز مشتاق لاپتہ ہی رہتیں اور میں انہیں جاپانیوں کی قید میں نہ دیکھتا تو میں اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا تھا مگر اب میرے لئے اسے بچانا فرض ہو گیا ہے۔ آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں پکڑا گیا تو جاپانی چاہے میری تکا بوٹی کر دیں' میری زبان پر آپ کا اور نی ون پارٹی کے کسی آدمی کا نام نہ آئے گا۔"

اقبال صاحب نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا:۔

"میاں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اب نی ون نے بھی تمہاری مدد کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمہاری جتنی مدد کر سکا' کروں گا۔ لیکن صرف ایک خاص حد تک۔ اس کے آگے نہیں۔ کیوں کہ مجھے یہاں رہنا ہے۔"

دوسرے روز نی ون صبح کو جلدی آ گیا۔ کاریگروں کو اس نے آگے بھیج دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک سکیم لے کر آیا تھا۔ کہنے لگا:۔

"سکیم میں نے سوچ لی ہے مگر میں ابھی بتاؤں گا نہیں۔ صرف اتنا ہی بتانا چاہتا ہوں کہ جو ہندوستانی لڑکیاں جاپانیوں نے داشتاؤں کے طور پر رکھی ہوئی ہیں' ان میں ایک سکھ لڑکی بھی ہے' جس کا نام ہرجیت ہے۔ وہ جاپانیوں سے بہت گھل مل گئی ہے اور اس نے جاپانیوں کے ساتھ رہنا قبول کر لیا ہوا ہے۔ وہ گیریژن کے احاطے میں آزادی سے چلتی پھرتی رہتی ہے۔"

اس سے میری بھی کئی بار گفتگو ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسز مشتاق کو فرار کروانے میں' میں اس کی مدد لے سکتا ہوں۔"

اقبال صاحب بولے:۔

"تو کیا وہ مسز مشتاق کے ساتھ خود بھی فرار ہونا پسند نہیں کرے گی؟"

نی ون کچھ سوچ کر بولا:۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا' اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس جاپانی افسر کی داشتہ بنی ہوئی ہے' اس کو پسند کرنے لگی ہے اور اس جاپانی افسر نے اس سے وعدہ بھی کیا ہوا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ جاپان لے جائے گا اور اس سے شادی کر لے گا۔ ہو سکتا ہے یہ جاپانی افسر اس سے جھوٹ

بول رہا ہو لیکن ہرجیت اس سے محبت کرنے لگی ہے اور وہ اس کے ساتھ ہی گیریژن میں رہنا چاہتی ہے۔"

میں نے نی ون سے سوال کیا:۔

"یہ سکھ لڑکی مسز مشتاق کو کیسے فرار کروا سکے گی؟"

نی ون بولا:۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ ابھی تو تم میرے ساتھ کام پر چلو۔ مگر وہاں مسز مشتاق کے قریب جانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔ میں تمہیں ہرگز اپنے ساتھ نہ لے جاتا لیکن اس طرح جاپانیوں کو شک پڑ سکتا ہے کہ ایک کاریگر کو میں ایک دن لایا تھا اور پھر دوسرے دن وہ غائب کیوں ہو گیا۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔"

اقبال صاحب نے گھر سے نکلتے وقت مجھے خاص طور پر تاکید کی کہ میں گیریژن میں مسز مشتاق کے قریب جانے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ میں ایسی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔ نی ون مجھے میرے برمی کاریگر ساتھی کے حوالے کر کے خود چلا گیا۔ برمی دوست کو اس نے پہلے سے سب کچھ سمجھا دیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:۔

"وہ لڑکی اوپر ہے۔ آج تم اوپر کام نہیں کرو گے۔ میرے ساتھ یہاں برآمدے میں کام کرو گے۔ تمہیں اس لئے میں نے برآمدے میں اپنے ساتھ رکھ لیا ہے کہ جاپانی سپاہی اور افسر تمہیں کام کرتا دیکھ سکیں۔"

میں خاموشی سے برآمدے کی دیواروں پر رنگ پھیرتا رہا۔ اس دوران زاہدہ کی مجھے ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہ دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نی ون تو واپس چلا گیا ہے۔ وہ یہاں سکھ لڑکی ہرجیت سے کس وقت ملے گا۔

کیونکہ اس کے ساتھ مل کر ہی اس نے زاہدہ کے فرار کا منصوبہ تیار کرنا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ واپس نہیں گیا تھا بلکہ وہیں گیریژن میں ہی تھا اور کسی خاص جگہ پر سکھ لڑکی ہر جیت سے مل کر اس نے زاہدہ کے فرار کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ شام کو جب میں واپس آیا تو نی ون اقبال صاحب کے مکان پر پہلے سے ہی موجود تھا۔ اقبال صاحب نے مجھے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نی ون کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

"میاں! ہمارے کامریڈ نے مسز مشتاق کے فرار کی پوری سکیم تیار کر لی ہے۔ اب آگے تمہاری قسمت ہے کہ تم کامیاب ہوتے ہو یا کسی جاپانی سپاہی کی گولی تمہیں اگلے جہان پہنچا دیتی ہے۔ لیکن اس بات کی گارنٹی تمہیں دینا ہوگی کہ اگر تم اور زاہدہ زندہ پکڑے گئے تو کسی حالت میں بھی ہم لوگوں کا نام تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔"

میں نے کہا:۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں موت کو گلے لگا لوں گا لیکن آپ جیسے محسنوں کا نام کبھی جاپانیوں کو نہیں بتاؤں گا۔"

نی ون کہنے لگا:۔

"مسز مشتاق کو تم بالکل نہ بتانا کہ یہ سکیم کس نے تیار کی تھی۔ میں نے سکھ لڑکی ہر جیت کو بھی سمجھا دیا ہے۔ وہ بھی مسز مشتاق کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔"

اقبال صاحب نی ون کی بات کاٹ کر بولے:۔

"کامریڈ! اب اسے بتا دو کہ تمہاری سکیم کیا ہے۔"

کامریڈ نی ون صوفے پر آگے کو جھک آیا اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

”یہ سکیم سکھ لڑکی نے بڑی بہادری سے تیار کی ہے۔ اس سکیم کی کامیابی کا سارا دارومدار تم پر ہے۔ اگر تم نے جرات اور دلیری سے کام لیا تو تم مسز مشتاق کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر تم عین وقت پر گھبرا گئے یا ڈر گئے تو پھر تم دونوں کی موت یقینی ہے۔ اس لئے اب بھی وقت ہے۔ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کر لو۔“

میں نے سینہ تان کر کہا:۔

”کامریڈ! میں پیچھے ہٹنے والا آدمی نہیں ہوں۔ تم مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔“

اقبال صاحب کا برمی دوست کامریڈ نی ون ذرا سا مسکرایا:۔

”تم واقع دلیر عاشق ہو۔“

تب مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر میرا بھید کھل چکا ہے۔ اب مجھے اسکی پرواہ نہیں تھی۔ اقبال صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کامریڈ نی ون کہنے لگا:۔

”میں نے سکھ لڑکی ہر جیت سے ساری سکیم طے کر لی ہے۔ ہر جیت مسز مشتاق کے ساتھ فرار ہونے کو تیار نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ میں اپنے جاپانی افسر کے ساتھ جاپان جاکر شادی کروں گی۔ اب فرار کے منصوبے کو غور سے سنو۔ یہ سب کچھ کل آدھی رات کے بعد کسی وقت بھی ہو جائے گا۔ جاپانی فوج کے گیریژن کے پیچھے ایک کھائی ہے جس میں برساتی نالہ بہتا ہے۔ اس نالے میں ایک بہت بڑا اسیمنٹ کا پائپ گیریژن کی عمارت کا گندا پانی لے کر گرتا

ہے۔ جہاں سے یہ پائپ کھائی کی ڈھلان میں نیچے جاتا ہے' وہاں گیریژن کی دیوار میں لوہے کا ایک چھوٹا سا سلاخ دار دروازہ بنا ہوا ہے۔ اس دروازے میں سے صفائی وغیرہ کرنے والے دن میں ڈرموں میں بھرا ہوا کوڑا کرکٹ لا کر کھائی میں پھینکتے ہیں۔ دن کے وقت یہ لوہے کی سلاخوں والا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ رات کے وقت یہ دروازہ بند کر کے اس کے اندر کی طرف تالا لگا دیا جاتا ہے۔ کل آدھی رات کے بعد کسی بھی وقت سکھ لڑکی ہرجیت کور مسز مشتاق کو لے کر آئے گی اور اس دروازے کو کھول کر اسے دروازے سے باہر نکال دے گی۔ اس وقت تمہیں کھائی کے نشیب میں سیمنٹ کے بڑے پائپ کے قریب چھپا ہوا ہونا چاہیے۔ تم مسز مشتاق کو ساتھ لے کر برساتی نالہ پار کر کے دریا کی طرف نکل جاؤ گے۔ دریا کے کنارے ہمارا ایک آدمی کشتی لے کر تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ تم دونوں اس کشتی میں سوار ہو جاؤ گے۔ وہ تمہیں دریا پار کرا کر واپس آ جائے گا۔ دریا کے دوسرے کنارے ناریل کے درختوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اس کے آگے تمہیں ایک چھوٹی سی سڑک ملے گی۔ یہ سڑک تمہیں اس جنگل میں لے جائے گی' جہاں سے اس وقت رنگون سے بھاگے ہوئے ہندوستانیوں کے قافلے پروم جا رہے ہوں گے۔ وہاں تم بھی کسی قافلے میں شامل ہو جانا۔"

میں بڑے غور سے منصوبے کی ایک ایک تفصیل اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جا رہا تھا۔ میں نے کامریڈ نی ون سے پوچھا:۔

"کچرا پھینکنے والے آہنی جنگلے کا تالا کیسے کھلے گا؟"

"یہ سارا کام سکھ لڑکی ہرجیت کور خود ہی کر لے گی۔ تم اسکی فکر نہ کرو۔"

نی ون نے اقبال صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"اس پنجابی لڑکی ہرجیت کور نے بڑی دلیری کا ثبوت دیا ہے۔ کل کی رات وہ اپنے جاپانی افسر کے کوارٹر میں گزارے گی۔"

میں نے نی ون سے ایک اہم سوال پوچھا:۔

"کچرے کے آہنی جنگلے کے آگے تو رات کو جاپانی سپاہی پہرہ دیتا ہے۔ اس کو وہاں سے کون ہٹائے گا۔"

کامریڈ نی ون مسکرا کر بولا:۔

"تم اسکی فکر کیوں کرتے ہو۔ یہ سارا کام سکھ لڑکی کرے گی۔ آہنی جنگلے کی چابی رات کو اس جاپانی افسر کے کوارٹر میں ہی رہتی ہے۔ سکھ لڑکی یہ چابی لے کر کوارٹر سے نکلے گی اور پہرے پر کھڑے جاپانی سپاہی سے بھی وہ خود ہی نپٹ لے گی۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے' یہ سکھ لڑکی سارا کام شراب اور عشق بازی کے حربوں کو زیر استعمال لا کر کرے گی۔ بہر حال تم کل کی رات یہاں نہیں بلکہ گیریژن کے عقبی برساتی نالے کی جھاڑیوں میں گزارو گے۔"

دوسرے روز میری ذہنی کیفیت یہ تھی کہ کبھی خوش ہوتا تھا کہ آج رات میں زاہدہ کو جاپانیوں کی قید میں سے نکال کر لے جاؤں گا اور کبھی ایکدم سے پریشان ہو جاتا کہ اگر کوئی بھول چوک ہو گئی تو میرے ساتھ زاہدہ بھی ہلاک ہو جائے گی اور جاپانی افسر ہرجیت کور کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر پوچھ گچھ کے دوران ہرجیت کور جاپانیوں کی اذیت برداشت نہ کر

سکی اور اس نے اقبال صاحب اور کامریڈ نی ون کے نام بتا دیئے تو یہ سب لوگ شوٹ کر دیے جائیں گے۔ اسی کش مکش میں شام ہو گئی۔

اقبال صاحب نے مجھے سوکھے چنے ایک تھیلی میں ڈال کر دیئے اور کہا:۔

"جنگل میں ہندوستانی مہاجرین کے قافلے میں شامل ہونے تک یہ تمہارے کام آئیں گے۔ روپے تمہارے پاس موجود ہی ہیں۔ یہ ایک جیکٹ ہے' یہ مسز مشتاق کو پہنا دینا۔ باقی سب کچھ تم دونوں کی ہمت پر منحصر ہے۔ کامریڈ نی ون نے تمہارے لئے وہ کچھ کیا ہے' جو شاید کوئی اور نہ کرتا۔"

میں نے اقبال صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ان کے توسط سے کامریڈ نی ون سے ملاقات ہوئی اور کامریڈ نے ان کی وجہ سے اس مشکل میں ہمارا ساتھ دیا۔ اقبال صاحب نے ایک بار پھر مجھے یاد کراتے ہوئے کہا:۔

"میاں! یہ فرار کا منصوبہ ہے۔ کامیاب بھی ہو سکتا ہے اور ناکام بھی۔ ناکامی کی صورت میں اگر تم پکڑے گئے تو ان جاپانیوں کے پاس راز اگلوانے کے ایسے ایسے اذیت ناک ہتھیار ہیں کہ وہ تم سے سب کچھ معلوم کر لیں گے۔"

میں نے ایک بار پھر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں اگر پکڑا گیا تو ہر قسم کی اذیت سہ لوں گا مگر ان لوگوں کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔ اقبال صاحب مجھے کچھ زیادہ ہی فکر مند نظر آ رہے تھے۔ ان کا فکر مند نظر آنا حق بجانب تھا۔ میں آج بھی ان کے انسانی کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہوں گا کہ انہوں نے اور کامریڈ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ رات دس بجے تک اقبال صاحب اپنے مکان کے اوپر والے کمرے میں بیٹھے مجھے یہی سمجھاتے

رہے کہ دریا پار کرنے کے بعد جتنی دور نکل سکے‘ نکل جانا اور جب تک مسز مشتاق کے ساتھ کسی قافلے میں نہیں پہنچ جاتے راستے میں کسی جگہ نہ رکنا۔

گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے کہ کامریڈ نی ون کی جیپ آگئی۔ جیپ میں کامریڈ خود نہیں تھا۔ اسکا ڈرائیور تھا۔ اقبال صاحب نے مجھے گلے لگا کر کہا:۔

"جاؤ میاں اللہ کے حوالے۔ جو باتیں میں نے تم سے کی ہیں‘ ان کا خیال رکھنا۔"

میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر بازار میں آگیا۔ جیپ میں بیٹھا اور جیپ چل پڑی۔ رات کے وقت رنگون کے بازاروں میں وہ رونق نہیں تھی جو جاپانیوں کے قبضے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو جاپانی رات کو کرفیو لگا دیتے تھے۔ اب کرفیو تو نہیں لگتا تھا لیکن سڑکیں رات کو جلد ویران اور سنسان ہو جاتی تھیں۔ جیپ میرے جانے پہچانے بازاروں اور چوراہوں میں سے گزرتی ہوئی ایسے علاقے میں داخل ہو گئی جو میرے لئے اجنبی تھا۔ جیپ کافی رفتار سے جا رہی تھی۔ کیونکہ بازار تقریباً خالی تھے۔ کسی کسی وقت کوئی گاڑی سامنے سے آجاتی تھی۔

پھر شہر کی عمارتیں ختم ہونا شروع ہو گئیں اور غیر آباد زمین آگئی۔ یہاں سڑک پر کہیں کہیں روشنی تھی۔ ایک جگہ سے جیپ نشیب میں اتر گئی۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ صرف ڈرائیور کی سیٹ اور ساتھ والی سیٹ پر ترپال نہیں تھی۔ میں رات بارہ بجے سے پہلے پہلے گیریژن کی عقبی کھائی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے ٹائم پوچھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہا:۔

"ابھی بارہ نہیں بجے"۔

میں سمجھ گیا کہ ڈرائیور کو کامریڈنی ون نے بتادیا ہے کہ مجھے ٹھیک بارہ بجے ایک خاص جگہ پہنچانا ہے۔ جیپ اب نیم جنگلی علاقے سے گزر رہی تھی جہاں سڑک چھوٹی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں بڑے بڑے درختوں کے تنے بھی سایوں کی طرح نظر آتے تھے۔ جیپ کی روشنیاں ڈرائیور نے اس علاقے میں داخل ہوتے ہی بجھا دی تھیں۔ سڑک ایک جگہ سے گھوم کر دوسری طرف آئی تو مجھے دور بلندی پر روشنیاں دکھائی دیں۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ جاپانی فوجی گیریژن کی روشنیاں ہیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یااللہ! میری مدد کرنا۔ بے اختیار میرے دل نے دعا مانگی۔ جیپ گیریژن کی روشنیوں کے پہلو میں سے گزرتی ہوئی بائیں جانب مڑ گئی۔ آگے گھپ اندھیرا تھا۔ ڈرائیور نے جیپ کی رفتار بالکل آہستہ کر دی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ جیپ کسی ٹیلے کی چڑھائی چڑھ رہی ہے۔ پھر جیپ ہموار جگہ پر آ گئی۔ یہاں ڈرائیور نے جیپ روک لی اور اپنے ساتھ مجھے نیچے اتار کر ذرا سی چڑھائی چڑھنے کے بعد بولا:۔

"یہاں سے نیچے برساتی نالے کی کھائی ہے۔ کامریڈ نے مجھے اس جگہ پہنچانے کو کہا تھا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

برمی ڈرائیور نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ جیپ میں بیٹھا، اسے گھما کر نیچے لے گیا اور پھر جس طرف سے آیا تھا، اس طرف کو اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چار پانچ سیکنڈ کے بعد جیپ کے انجن کی آواز بھی ختم ہو گئی۔

میں جھاڑیوں کے پاس اندھیرے میں کھڑا سامنے دیکھ رہا تھا۔ سامنے گیریژن کی عقبی خاردار دیوار کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ بجلی کے بڑے بڑے بلبوں کی روشنیاں تھیں، جو خاردار دیوار پر فاصلہ چھوڑ کر لگی

ہوئی تھیں۔ میرے اور گیریژن کے درمیان سے برساتی نالہ گزرتا تھا۔ یہ کھائی اوپر سے کافی چوڑی تھی۔ اس کی دیواریں جن پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، نشیب میں برساتی نالے تک اترتی چلی گئیں تھیں۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا ڈھلان اترنے لگا۔ یہاں تک کہ میں برساتی نالے کے کنارے پہنچ گیا۔ نالہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس میں پانی ایک چوڑی لکیر کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ مجھے اب اس گٹر یا پائپ کی تلاش تھی جو گیریژن کی عقبی دیوار میں سے نالے میں گرتا تھا۔ میں پہلے تو مشرق کی جانب چلتا گیا۔ کافی دور چلنے کے بعد بھی جب پائپ نہ ملا تو الٹے رخ چلنا شروع کر دیا۔ نالے میں دور اوپر گیریژن کی خاردار دیوار پر جو بلب روشن تھے، ان کی روشنی بہت کم پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس روشنی میں، میں نالے کے پانی اور جھاڑیوں کو صاف دیکھ رہا تھا۔ میں کوئی ایک فرلانگ تک نالے کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ میں ناامید ہو کر واپس مڑنے لگا تھا کہ مجھے گیریژن کی خاردار دیوار میں سے اوپر کی جانب سے ایک موٹا پائپ نیچے آتا نظر آ گیا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ یہ سیمنٹ کا بڑا پائپ تھا اور اوپر سے جھک کر نیچے نالے تک آیا ہوا تھا۔ میں پائپ کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اوپر نظریں جما دیں۔ آگے آکر مجھے لوہے کا وہ سلاخ دار چھوٹا سا دروازہ نظر آ گیا جہاں سکھ لڑکی ہرجیت کور نے زاہدہ کو رات بارہ بجے کے بعد کسی بھی وقت لے کر آنا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں جاپانی سپاہی رات کو پہرے پر ہوتا ہے۔ اس لئے میں نالے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ۔نالے کا گندا پانی بھی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ سیمنٹ کے پائپ میں سے پانی ڈھلان میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر گر رہا تھا، جسکی وجہ سے اسکی آواز نہیں

آرہی تھی۔ یہ اس کچرے اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا جو کامریڈ نی ون کے مطابق دن کے وقت گیریژن کے سلاخوں والے دروازے میں سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ اوپر خاردار تاروں کی دیواروں کے ساتھ تھوڑی روشنی تھی۔ بجلی کا بلب وہاں سے کچھ فاصلے پر دیوار کے اوپر لگا تھا۔ اس روشنی میں' میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جاپانی سپاہی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جو وہاں پہرہ دے رہا تھا۔ مجھے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ لوہے کا سلاخ دار دروازہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس میں سے منصوبے کے مطابق سکھ لڑکی نے زاہدہ کو باہر نکالنا تھا۔ بہر حال مجھے رات کا باقی حصہ وہیں گزارنا تھا۔ کیونکہ کامریڈ نی ون نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد صبح ہونے سے پہلے پہلے سکھ لڑکی کسی بھی وقت مسز مشتاق کو لے کر وہاں آ سکتی ہے۔ پھر مجھے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ اگر سکھ لڑکی نہ آ سکی۔ اس کے منصوبے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو مجھے کس قدر مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

رات بھیگی ہوئی تھی۔ یہ جنوبی ایشیا کی روایتی مرطوب رات تھی۔ پیچھے دریا کی طرف سے جو ہوا آ رہی تھی اس میں رطوبت اور ٹھنڈک تھی۔ مگر سردی بالکل نہیں تھی۔ اقبال صاحب نے مجھے بھنے ہوئے چنوں کی جو تھیلی دی تھی وہ میری کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میرے پاس اپنی جو رقم تھی' وہ بھی میں نے رومال میں لپیٹ کر کمر کے گرد باندھ رکھی تھی۔ انہوں نے مجھے زاہدہ کے لئے جو جیکٹ دی تھی' وہ میں نے قمیض کے اوپر پہن لی تھی۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ مجھے مچھر بھی تنگ کر رہے تھے۔ بہر حال مجھے وہاں بیٹھ کر زاہدہ کا انتظار کرنا تھا۔ میں بیٹھا رہا۔ مچھر زیادہ پریشان کرتے تو اٹھ کر نالے کے ساتھ

ساتھ تھوڑی دور تک ٹہلتا اور پھر سیمنٹ کے پائپ کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ دل میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ سکھ لڑکی کا منصوبہ کامیاب ہو جائے اور وہ پروگرام کے مطابق زاہدہ کو نکال کر لے آئے۔ رات خاموش تھی۔ اس خاموشی میں ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی فوجی ٹرک ہی ہو گا۔ کیونکہ آواز اوپر گیریژن کی طرف سے آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی اور پھر وہی اکتا دینے والی خاموشی چھا گئی۔ میرا خیال ہے مجھے وہاں انتظار کرتے کرتے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے ہوں گے کہ رات کے سکوت میں مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے لوہے کے جنگلے کو کھولا ہو۔ میں اندھیرے اور مدہم روشنی میں اوپر گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

آہنی دروازہ مجھ سے اوپر کافی بلندی پر تھا اور وہاں سے نیچے نالے تک ڈھلان تھی۔ مجھے ایسے معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے لوہے کے جنگلے والا دروازہ کھول دیا ہے۔ میری نظریں جنگلے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے وہاں دو انسانی سائے نظر آئے۔ پھر ایک سایہ جنگلے میں سے گزر کر نیچے ڈھلان پر اتر گیا اور دوسرا سایہ پیچھے ہٹ گیا۔ میرے خدا! یہ زاہدہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ سکھ لڑکی کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ اس نے وعدے کے مطابق زاہدہ کو جاپانی فوجیوں کے جہنمی کیمپ سے باہر نکال دیا تھا۔ میں بے اختیار ہو کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ پھر جلدی سے جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ یونہی مجھے خطرہ لگا کہ کہیں اوپر سے مجھے کوئی جاپانی نہ دیکھ لے۔ حالانکہ اوپر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ صرف ایک انسانی ہیولا تھا جو جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر نیچے اتر رہا تھا۔ جب یہ ہیولا مجھ سے کوئی بیس پچیس فٹ کے قریب آیا تو میں نے قد و قامت سے زاہدہ کو پہچان لیا۔ شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے آہستہ سے کہا:

"زاہدہ!"

زاہدہ نے میرا نام لیا اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تیزی سے نیچے آگئی۔ اور میرے ساتھ لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے کہا:

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔"

میں نے اسکا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ایک جگہ سے ہم نے برساتی نالا عبور کیا اور نالے کی دوسری جانب کی چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ زاہدہ کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ مگر اس پر اتنی زیادہ گھبراہٹ طاری نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مصیبتوں اور آفتوں کو سہتے سہتے سخت جان ہو گئی تھی۔ ہم نالے کے دوسرے کنارے کے اوپر آ گئے۔ آگے وہی چھوٹی سی جنگلی سڑک تھی جہاں مجھے کامریڈ نی ون کی جیپ اتار گئی تھی۔ نی ون نے کہا تھا کہ نالہ پار کرنے کے بعد سامنے والے درختوں کے اندر چلے جانا۔ آگے دریا آجائے گا۔ دریا کے کنارے میرا آدمی کشتی لئے تمہارا انتظار کر رہا ہو گا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے دریا کتنی دور ہے۔ میں نے ابھی تک زاہدہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے تیزی سے اپنے ساتھ دوڑاتے ہوئے چھوٹی سی سڑک پار کر کے درختوں کے اندھیرے میں داخل ہو گیا۔

یہاں اندھیرا بہت گہرا تھا اور ہم غور سے دیکھ دیکھ کر چل رہے تھے۔ زاہدہ نے خوف زدہ آواز میں پوچھا:

"یہاں جاپانی تو نہیں آجائیں گے؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا:

"جاپانیوں سے تو ہم بھاگ کر آ رہے ہیں۔ فکر نہ کرو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

ہم درختوں میں چلتے چلے گئے۔ ہوا میں ان سرکنڈوں کی خوشبو آنے لگی جو دریا کے کنارے کنارے پانی میں آدھے ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی مچھلیوں کی ہلکی ہلکی بو بھی آنے لگی تھی۔ دریا قریب آ رہا تھا۔

زاہدہ نے آہستہ سے پوچھا:

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے سرگوشی میں کہا:

"ابھی خاموش رہو۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔"

زاہدہ نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے جیکٹ پہنا دوں مگر اتنا وقت نہیں تھا۔ اس وقت میں جتنی جلدی ہو سکے' دریا پر پہنچنا چاہتا تھا۔ کیونکہ پروگرام کے مطابق ایک آدمی وہاں کشتی لئے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ دوسرے مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ پیچھے اگر جاپانیوں کو زاہدہ کے فرار کا پتہ چل گیا تو وہ ہماری تلاش میں نکل پڑیں گے اور ہمیں دریا پر پہنچنے سے پہلے پہلے دبوچ لیں گے۔ درختوں کے جھنڈ ختم ہو گئے اور سامنے رات کے اندھیرے میں دریا کا مٹیالا مٹیالا کھلا پاٹ نظر آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کھلی جگہ پر آ جانے سے رات کا اندھیرا مدھم ہو گیا تھا اور جھاڑیوں کے خاکے دکھائی دینے لگے تھے۔ دریا کا کنارا نرم اور دلدلی تھا۔ ہم اس سے بچ کر دریا کے بہاؤ کی طرف چلنے لگے۔ زاہدہ میرے بالکل ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں نے اسے کہا:

"یہاں ایک آدمی کشتی لے کر آیا ہوا ہے' خدا جانے وہ کتنی دور ہو گا......"

زاہدہ نے میرا بازو پکڑ رکھا تھا اور کہنے لگی:

"وہ تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

زاہدہ نے چلتے چلتے پوچھا: "تمہیں میرا کیسے پتہ چلا؟"

میں نے کہا:

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر سناؤں گا۔"

مجھے اندھیرے میں دریا کے کنارے کوئی چیز نظر آئی۔ یہ کشتی ہی تھی۔ قریب آکر میں نے زاہدہ کو پیچھے کر دیا اور آہستہ سے کہا: "تم یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں پتہ کرتا ہوں' یہ کشتی اپنی ہے یا نہیں؟"

زاہدہ کو جھاڑیوں کے پاس بٹھا کر میں بڑی احتیاط سے چلتا کشتی سے کچھ فاصلے پر درخت کی اوٹ میں ہو کر کشتی کو دیکھنے لگا۔ کشتی خالی تھی۔ میں دبے پاؤں گھاس میں گذرتا کشتی کے قریب آ گیا۔ کشتی چھوٹی اور عام قسم کی تھی جو درخت کا تنا کھود کر بنائی گئی تھی۔ اسے برمی زبان میں سمپان کہتے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ فوجی کشتی تو نہیں ہے۔ اتنے میں اندھیرے میں سے ایک ناٹے قد کا برمی نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے شکستہ ہندوستانی میں پوچھا کہ میں کون ہوں۔ میں نے جواب میں کہا:

"کامریڈ نی ون نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

یہ برمی کشتی کا ملاح تھا اور وہی وہاں کشتی لے کر آیا تھا۔ کہنے لگا: "عورت کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "پیچھے ہے۔"

"جلدی سے اسے لے کر آ جاؤ۔"

یہ کہہ کر برمی ملاح کشتی کی رسی کھولنے لگا جو اس نے ایک درخت سے باندھی ہوئی تھی۔ میں واپس گیا اور زاہدہ کو لے کر آ گیا۔ ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ برمی ملاح جلدی جلدی دونوں جانب ایک ہی چپو چلاتے ہوئے

کشتی کو کنارے سے نکال کر لے گیا۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ کشتی جب دریا کے وسط میں پہنچی تو پانی کی تیز لہروں میں ڈگمگانے لگی۔ زاہدہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

برمی ملاح نے درشت لہجے میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے بڑی مہارت سے کشتی کو قابو میں کیا اور اسے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف لے جانے لگا۔ پانی کا تیز بہاؤ کشتی کو آگے لے جا رہا تھا۔ برمی ملاح مشین کی طرح کبھی بائیں جانب اور کبھی دائیں جانب پانی میں تیز تیز چپو چلا رہا تھا۔ کافی آگے جا کر کشتی دریا کے دوسرے کنارے کے ساتھ آ کر لگ گئی۔ میں نے زاہدہ کو سہارا دے کر کشتی میں سے اتارا اور برمی ملاح سے کہا:

"کامریڈ نی ون سے میرا تھینک یو کہنا۔"

برمی ملاح نے آگے سے کوئی جواب نہ دیا اور کشتی کو کنارے سے ہٹا کر دوسرے کنارے کی طرف کھینے لگا۔ رات کے اندھیرے میں ہم سامنے والے درختوں کی طرف چل پڑے۔ کامریڈ نی ون نے کہا تھا کہ دریا پار کرنے کے بعد تمہیں ناریل کے درختوں کا ذخیرہ ملے گا۔ اس کے آگے ایک چھوٹی سی سڑک ہو گی جو گھنے جنگل میں لے جائے گی۔ اس جنگل میں تمہیں رنگون سے بھاگ کر ہندوستان کی سرحد کی طرف جاتے مہاجرین کے قافلے ملیں گے۔ میں نے زاہدہ کو بھی یہ ساری تفصیل بتا دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ناریل کے درختوں کا ذخیرہ آ گیا۔ یہاں ناریل کے درختوں نے آسمان پر ایک چھت ڈال رکھی تھی۔ درختوں کے پتلے تنے اندھیرے میں کالے ستونوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"خدا کا شکر ہے ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔"

زاہدہ خاموش رہی۔ زاہدہ جب سے جاپانیوں کی قید سے نکل کر میرے ساتھ آئی تھی۔ اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ یہ قدرتی امر تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس پر جاپانیوں نے جو تشدد کیا ہے' یہ اس کا اثر ہے۔ خدا جانے جاپانیوں نے اس کے ساتھ کیسا کیسا بہیمانہ سلوک نہیں کیا ہو گا۔ میں اس بارے میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا۔ اب میری ایک ہی خواہش اور ایک ہی مشن تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں زاہدہ کو زندہ سلامت لاہور اس کے ماں باپ کے پاس پہنچادوں۔

میں اسے بالکل اپنے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ ناریل کے درختوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں کھول کھول کر غور سے دیکھا۔ آگے ایک پتلا سا راستہ اونچی نیچی چٹانوں میں سے ہوتا ہوا ایک سیاہ دیوار کی طرف جاتا تھا۔ یہ سیاہ دیوار کافی فاصلے پر تھی۔ اصل میں یہ کوئی دیوار نہیں تھی بلکہ اس جنگل کے درختوں کی پہلی قطار تھی جس میں پہنچ کر مجھے ہندوستان جاتے کسی قافلے کے ساتھ شامل ہونا تھا۔

میں نے زاہدہ کو جنگل کی سیاہ دیوار دکھاتے ہوئے کہا:

"ہمیں اس جنگل میں جانا ہے۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی قافلہ ہندوستان کی طرف جاتا مل جائے گا۔ رنگون سے سارے ہندوستانی گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ جو رنگون سے ادھر ادھر مضافات میں کاروبار کرتے تھے' وہ بھی چھوٹے چھوٹے قافلوں کی شکل میں چل پڑے ہیں۔ مجھے میرے دوست نے بتایا تھا کہ یہ قافلے اسی جنگل میں سے گزر کر پروم کی طرف جاتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی سرحد کی جانب جنگلوں کا راستہ پروم کی طرف سے ہی ہو کر جاتا ہے۔"

زاہدہ نے فکر مند لہجے میں پوچھا: ”کیا یہ قافلے پیدل جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا: ”میں نے ایک قافلے کو جاتے دیکھا ہے۔ مرد اس قافلے کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو انہوں نے بیل گاڑیوں میں بٹھایا ہوا تھا۔“

چند قدم اندھیرے میں پتلی سی سڑک پر چلنے کے بعد زاہدہ نے کہا:

”تم مجھے وہاں سے کیوں نکال کر لے آئے ہو۔ اب میں اس قابل نہیں ہوں کہ اپنے ماں باپ کے گھر جاسکوں۔“

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ زاہدہ نے پہلی بار اپنے ضمیر کی خلش کا اظہار کیا تھا۔ میں نے کہا:

”جنگ میں بہت کچھ ہو جاتا ہے زاہدہ۔ خدا کا شکر کرو کہ تم زندہ سلامت رہیں۔“

زاہدہ نے سسکی بھر کر کہا: ”اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے اس جگہ چھوڑ دو۔ میں کسی ندی میں کود کر جان دے دوں گی۔“

میں نے زاہدہ کو اپنے ساتھ لگانا چاہا۔ زاہدہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

”خدا کے لئے مجھ سے دور رہو۔“

اور وہ وہیں بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے کس طرح اسے تسلی دی اور اسے اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا۔ میں تو خود زاہدہ سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا کہ رات کے وقت اکیلی جب وہ نکل کھڑی ہوئی تھی تو جاپانیوں کے ہتھے کیسے چڑھی اور پھر اس کے

ساتھ کیا بیتی؟ وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ یہ تھوڑی کھلی جگہ تھی۔ آسمان پر تارے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ تارے بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ برما کے جنگلوں میں جنوری فروری کے مہینوں میں بھی بارشیں ہو جاتی ہیں۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو وہاں سر چھپانے کو بھی کہیں جگہ نہیں تھی۔

رات کا اندھیرا اب ہمیں راکھ کے رنگ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس اندھیرے میں ہمیں جھاڑیاں اور راستہ دھندلا دھندلا باقاعدہ نظر آ رہا تھا۔ چلتے چلتے آخر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے گھنا جنگل شروع ہوتا تھا۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کالی کالی سیاہ چٹانیں زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں سے آگے اتنے اونچے اونچے اور گھنے درخت کھڑے تھے کہ رات کے اندھیرے میں انہیں دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا اور گہرا سکوت تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ خدا جانے اتنے گنجان جنگل کے اندر کیسے کیسے حشرات الارض اور زہریلے سانپ اور درندے ہوں گے۔ میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ رات کے وقت ہم اس جنگل میں داخل نہیں ہوں گے۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"جنگل میں رات کے وقت جانا خطرناک ہو گا۔ میرا خیال ہے ہم باقی کی رات یہیں کہیں کاٹ دیتے ہیں۔ صبح کا اجالا ہو گا تو جنگل میں داخل ہوں گے۔"

زاہدہ میرے قریب ہی چٹان کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں ہم دونوں چھپ کر رات گزار لیں۔ تین چار گھنٹے ہی رات باقی رہ گئی تھی۔ اگرچہ

اتنی دور تک جاپانیوں کا زاہدہ کی تلاش میں آنا بعید از قیاس لگتا تھا۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ زاہدہ کے فرار کا علم جاپانیوں کو دن نکلنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ بہادر سکھ لڑکی ہر جیت کور نے اسکا پورا بندوبست کر لیا ہوگا کہ فرار کا علم رات میں کسی کو نہ ہو۔ اس کے باوجود میں کسی خوش فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد مجھے ایک چٹان کے اندر بنی ہوئی قدرتی کھوہ مل گئی۔ یہ کوئی پندرہ بیس فٹ لمبی اور پانچ فٹ چوڑی جگہ تھی۔ میں زاہدہ کو لے کر کھوہ کے اندر آگیا۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھوں سے زمین صاف کی اور اپنی جیکٹ اتار کر زمین پر ایک طرف بچھادی اور زاہدہ سے کہا:

"تم نے شاید مغل سٹریٹ والے اقبال صاحب کا نام سنا ہوگا۔ وہاں ان کی فرنیچر کی دکان ہے۔"

زاہدہ نے خشک آواز میں کہا:

"ہاں سنا ہے۔"

میں نے کہا:۔

"انہوں نے تمہارے فرار میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے تمہارے مرحوم خاوند کے ساتھ اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ جیکٹ انہوں نے خاص طور پر مجھے یہ تاکید کر کے دی تھی کہ اسے ہماری بھابی مسز مشتاق کو دے دینا۔"

مجھے اندھیرے میں ایسی آواز سنائی دی جیسے زاہدہ نے سسکی بھری ہو۔ اصل میں اپنے مرحوم خاوند کا نام سن کر اس کا دل بھر آیا تھا۔

میں نے کیوں اس کے خاوند کا نام لے دیا۔ یہاں میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔ مگر یہ جھوٹ زاہدہ کی روحانی تسکین کے لئے بہت ضروری تھا۔ میں نے اسے کہا:

"میں تمہیں اقبال صاحب کا ایک اور نیک کام بتانا چاہتا ہوں۔ جب میں تمہاری تلاش میں جمیل صاحب کے دوست کے گاؤں سے نکلا تو مجھے یقین تھا کہ تم رنگون اپنے گھر ہی گئی ہوگی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح تمہیں تلاش کرتا رنگون پہنچ گیا اور سیدھا اقبال صاحب کے ہاں پہنچا۔ وہ رنگون میں ہی تھے۔ انہوں نے اپنی فیملی کو ایک قافلے کے ساتھ ہندوستان روانہ کر دیا تھا مگر خود رنگون میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا تو وہ بڑے فکر مند ہوئے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مسز مشتاق کے خاوند کی میت ابھی تک ان کے بنگلے میں پڑی ہے۔ اقبال صاحب نے اپنے دو مسلمان دوستوں کو ساتھ لیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ ہم تمہارے بنگلے پر پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ تم وہاں ہوگی۔ مگر تم وہاں نہیں تھیں۔ ہم نے مشتاق صاحب کی میت کو بیڈ روم سے نکال کر غسل دیا۔ انہیں باقاعدہ کفن پہنایا اور مکان کے پچھلے صحن میں قبر کھود کر دفن کر دیا۔ اوپر قبر بھی بنا دی اور فاتحہ بھی پڑھی"

میں چپ ہو گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زاہدہ پر اس کا کیا ردعمل ہوا ہے۔ غار کے اندھیرے میں مجھے اس کا جسم سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک سرد آہ کر بولی:۔

"جاپانی فوجی مشتاق کی قبر کو ڈھا دیں گے۔"

میں نے کہا: ”جاپانی وہاں کیا کرنے آئیں گے۔ ویسے بھی تمہارا مکان اقبال صاحب کے ایک برمی دوست نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اقبال صاحب نے کہا تھا، مسز مشتاق کو پیغام دینا کہ اس کے مکان اور اس کے خاوند کی آخری آرام گاہ اور دکان کی حفاظت میرے ذمے ہے۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں تو بے شک رنگون واپس آ کر اپنی امانت واپس لے لیں۔“

زاہدہ اندھیری غار میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں تھوڑی تھوڑی چمک رہی تھیں۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگی:

”کیا ہم واپس اپنے مکان میں جا سکیں گے؟ میں مشتاق کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ اقبال صاحب کے برمی دوست نے ان کے مکان اور دکان کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ میں نے اسے ایک اور جھوٹی تسلی دی اور کہا:

”کیوں نہیں واپس جا سکیں گے؟ جاپانی زیادہ دیر تک برما پر قبضہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ انگریز ضرور جوابی حملہ کریں گے اور جاپانیوں کو برما سے نکال دیں گے۔“

میں نے تھیلی کھولی اور زاہدہ کو تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دے کر کہا:

”تمہیں بھوک لگی ہے تو یہ چنے کھا لو۔ اقبال صاحب نے دیئے تھے کہ راستے میں کام آئیں گے۔“

پھر مجھے مسز جمیل کی بات یاد آ گئی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"مسز جمیل نے بھی تمہارے زیور امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لئے ہیں۔ اس نے کہا تھا مسز مشتاق سے کہنا تمہارے زیور ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں۔ اگر ہم زندہ بچ کر اور زیوروں کو بچاکر لاہور پہنچ گئے تو ہم تمہاری امانت تمہارے گھر پہنچادیں گے یا ہمارے گھر آ کر ہم سے لے لینا۔"

زاہدہ نے کچھ نہ کہا۔ میرے ہاتھ سے تھوڑے سے چنے لے لئے اور اپنی مٹھی میں بند کر کے اسی طرح بیٹھی رہی۔

میں نے کہا: "کیا بھوک نہیں ہے؟"

"نہیں..."

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ باہر جنگل پر ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرے سامنے ایک کٹھن، دشوار گذار بلکہ موت کی وادی کا لمبا سفر تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ راستے میں ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا تھا۔ سب سے پہلے تو جنگل میں کسی قافلے کو تلاش کرنا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی قافلہ مل بھی گیا تو سارے علاقے میں جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ وہ کسی بھی جگہ اچانک کسی طرف سے نکل کر قافلے کی عورتوں کو اٹھا کر لے جاسکتے تھے اور مردوں کو گولیوں سے بھون سکتے تھے۔ اگر اس خطرے سے بچ کر نکل گئے تو آگے برما کی دشوار گذار پہاڑیوں میں برمی ڈاکوؤں اور وحشی جنگلی قبیلوں کے حملے کا خطرہ تھا۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ جب سے رنگون کے مہاجرین کے قافلوں کا جنگلوں میں سفر شروع ہوا ہے، خونی ڈاکو ان جنگلوں کا رخ کر رہے ہیں۔ وہ قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں اور وہ بھی نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ایک دو جنگلوں کا سفر ہوتا تو زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ مگر یہ تو بڑا لمبا سفر

تھا۔ رنگون سے صوبہ بنگال کی سرحد پر کاکسز بازار تک جانا تھا جو کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر تھا۔

میں نے زاہدہ سے کہا: "تم کچھ دیر کے لئے سو جاؤ۔ میں باہر پہرہ دیتا ہوں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور عاجزی سے بولی:

"خدا کے لئے مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جاؤ' مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا:

"فکر کیوں کرتی ہو۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں۔ جنگل میں تھوڑی جاؤں گا۔ میں تو اس غار کے باہر بیٹھوں گا تاکہ کوئی جنگل جانور نہ آجائے۔"

میں نے زاہدہ کے ماتھے پر پیار کیا اور خاموشی سے اٹھ کر چٹانی غار کے دہانے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہیبت ناک جنگل تھا۔ جس کے اونچے اونچے سیاہ کالے درخت بھوتوں کی طرح کھڑے تھے۔ میں نے سر باہر کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ایک بھی تارا نہیں تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ آگے کیا کہ کہیں بارش تو شروع نہیں ہو گئی۔ لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ نیند آتی بھی کیسے؟ میں نے تھیلی میں سے تھوڑے سے چنے نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالے اور تھیلی بند کر کے قمیض کے نیچے کمر کے ساتھ باندھ لی۔ میں ایک ایک دانہ کر کے چنے کھانے لگا۔ جنگل میں ایسا سکوت طاری تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک مردہ جنگل ہے۔ کسی درندے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں چٹان کے غار میں سے ایک طرف کو نکلے ہوئے چوڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔ میں نے چٹان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔ مچھر غار کے اندر نہیں تھے مگر باہر وہ مجھے تنگ کر رہے تھے۔ لیکن میرا وہاں بیٹھنا بہت ضروری تھا۔ جاپانی نہ سہی' وہاں کوئی جنگلی درندہ انسانی بو پا کر آ سکتا تھا۔ کم از کم میں اسے پتھر مار کر بھگا ضرور سکتا تھا۔

نیند آ نہیں رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اٹھ کر غار کے آگے ٹہلنے لگتا۔ اسی طرح کافی وقت گزر گیا۔ اس دوران میں ایک دفعہ غار کے

اندر جاکر زاہدہ کو دیکھ آیا۔ وہ زمین پر بچھی ہوئی جیکٹ کے اوپر لیٹی تھی۔ شاید وہ سو رہی تھی۔ میں واپس آکر پتھروں پر بیٹھ گیا۔ آخر رات گذر گئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ میں غار کے اندر چلا آیا۔ زاہدہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ صبح صبح وہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے آہستہ سے زاہدہ کے پاؤں کو ہلا کر اسے جگایا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے کہا: "میں ہوں۔ اب ہمیں آگے چلنا ہے۔ دن نکل آیا ہے۔"

غار میں صبح کاذب کی پھیکی روشنی پھیل رہی تھی۔ زاہدہ جلدی سے اٹھی۔ اس نے چمڑے کے جوتے پہنے اور میرے ساتھ غار سے باہر نکل آئی۔ سامنے جنگل اب اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جگہ جگہ بانس کے نوکیلے درخت اور جنگلی جھاڑیاں راستہ روک رہی تھیں۔ درختوں پر پرندوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ جنگل رات کا تاریک لبادہ اتار کر بیدار ہو رہا تھا۔ میں اپنے حساب سے بالکل سیدھا چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم کوئی ایک گھنٹہ جنگل میں چلتے رہے۔ آخر کھلی جگہ آگئی۔ درخت دور دور ہو گئے تھے۔ یہاں بھوری چٹانیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ہم ذرا آگے گئے تو پانی گرنے کی آواز آئی۔ یہ ایک پہاڑی نالہ تھا۔ پانی خدا جانے اوپر کدھر سے آکر چٹانی پتھروں کی دیو ہیکل سلوں کے درمیان سے بہتا ہوا ایک کشادہ جگہ پر آکر ندی کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا۔ ہم وہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

ہم نے تھیلی میں سے چنے نکال کر کھائے۔ پہاڑی نالے کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دن کی روشنی کافی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس روشنی میں زاہدہ کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ جو گورا تھا' سانولا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں

حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ خدا جانے اس نے کیسے کیسے ظلم وستم سہے تھے۔ اب وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی تھی۔ اسکی خاموشی کی مہر ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے اسے اقبال صاحب والی جیکٹ پہنادی تھی۔ دوپٹہ اس نے سر پر باندھ لیا تھا۔ چاروں طرف جنگل کی طرف دیکھ کر بولی:

"ہمیں ہندوستان جانے والا قافلہ کہاں ملے گا؟"

میں نے کہا: "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کامریڈ نی ون نے تو یہی کہا تھا کہ ہندوستان جانے والے مہاجرین کے قافلے اسی جنگل میں سے ہو کر گذرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے جا کر کہیں ان قافلوں کا نشان مل جائے۔"

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ ابھی ہم اونچی اونچی ڈھلوان چٹانوں کے درمیان ہی سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایسی آوازیں آنے لگیں کہ جیسے کوئی زمین پر بھاری بھاری ہتھوڑے مار رہا ہو۔ پھر زمین ہتھوڑے کی ہر ضرب کے بعد ہلتی محسوس ہونے لگی۔ ہم وہیں رک گئے۔ میں نے زاہدہ کو وہیں رکنے کی ہدایت کی اور دوڑ کر پیچھے چٹانوں کے کنارے پر آگیا۔ سامنے جنگل کے آگے جو کھلی جگہ تھی وہاں ہاتھیوں کا ایک غول سونڈیں لہراتا جھومتا جھامتا چلا آرہا تھا۔ ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں خوف زدہ ہو کر واپس بھاگا اور زاہدہ سے کہا۔

"جنگلی ہاتھی آرہے ہیں۔ چٹانوں کے اوپر آجاؤ۔"

ہم تیزی سے ایک اونچی چٹان پر چڑھ گئے۔ ہاتھیوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا۔ یا شاید انہیں ہماری بو آگئی تھی۔ وہ سیدھے چٹان کی طرف آئے اور جس چٹان کے نیچے ہم نے پناہ لے رکھی تھی اس کے نیچے کھڑے ہو کر

سونڈیں اٹھا کر چنگھاڑنے لگ گئے۔ زاہدہ ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی۔ خوف سے اسکا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا:۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہاتھی چٹان کے اوپر نہیں چڑھیں گے۔"

ایک دو ہاتھیوں نے چٹان کے اوپر چڑھنے کی کوشش بھی کی، مگر چٹان کی چڑھائی بالکل سیدھی تھی۔ وہ اوپر نہ چڑھ سکے۔ لیکن کافی دیر تک وہیں کھڑے چنگھاڑتے رہے۔ آخر تھک ہار کر وہ آگے نکل گئے۔ میری جان میں جان آئی۔ ہم اس وقت تک چٹان کے اوپر ہی بیٹھے رہے، جب تک کہ ہاتھیوں کا غول جنگل میں دائیں بائیں غائب نہیں ہو گیا۔

"اب نیچے اتر آؤ۔"

زاہدہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی:۔

"جنگل میں ہاتھی پھر آجائیں گے۔"

میں نے کہا:۔

"جس طرف ہاتھی گئے ہیں، ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔"

چنانچہ ہم جنگل میں بائیں جانب ہو کر چلنے لگے۔ آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ ٹیلے سرسبز جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ٹیلوں کے ساتھ ساتھ ناریل اور بانس کے درختوں کے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ مگر درمیان میں چلنے کے لئے کافی جگہ تھی۔ ایک جگہ ہم نے سبز سانپوں کا جوڑا دیکھا جو ایک درخت کی شاخ سے لپٹا نیچے لٹک رہا تھا۔ زاہدہ چیخ مار کر میرے قریب آگئی۔ میں نے کہا:۔

"اس طرف سے جاؤ۔"

ہم درخت کی دوسری طرف سے ہو کر آگے نکل گئے۔ ہم جنگل کے وسط سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ درختوں پر بندر ہی بندر نظر آئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر چیخنے چلانے لگے۔ ایک دو لنگور ٹائپ کے بندر درخت سے چھلانگ لگا کر نیچے کودے اور انہوں نے جیسے ہمارا راستہ روک لیا۔ زاہدہ میرے پیچھے ہو گئی۔ میں نے سکول کے زمانے میں کتاب میں پڑھا ہوا تھا کہ بندر نقل اتارتے ہیں۔ اس وجہ سے میں نے بندروں کو پتھر نہیں مارے۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں نے انہیں پتھر مارے تو وہ بھی مجھے پتھر مارنا شروع کر دیں گے۔ دوسرے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ میں کچھ دیر وہاں زاہدہ کو اپنے پیچھے کیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ جب میں ان بندروں سے کافی فاصلے پر آ گیا تو میں نے زاہدہ کا ہاتھ پکڑا اور دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ ہم دوپہر تک چلتے رہے۔ جنگل یہاں گھنا نہیں تھا۔ بانس اور سنبل کے درختوں کے جھنڈ آتے اور پھر اونچی نیچی کھلی جگہ آ جاتی۔ زاہدہ چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔

"اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔"

میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ زاہدہ جوتے اتار کر اپنے پاؤں سہلا رہی تھی۔ اس کے جوتے کا ایک پاؤں آگے سے پھٹ گیا تھا۔ میں نے اپنا رومال اس میں اس طرح پھنسا دیا کہ زاہدہ کا انگوٹھا باہر نہ نکلے۔ میں زاہدہ کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔

"زاہدہ! ہم اکیلے ہی اس جنگل میں مصیبت کے مارے نہیں ہیں۔ رنگون سے بھاگے ہوئے ہزاروں بے خانماں خاندان ہماری طرح ان جنگلوں میں پیدل سفر کر رہے ہیں۔ آگے جا کر کوئی قافلہ ملا تو تم خود دیکھ لو گی۔ میں نے

یہ قافلے دیکھے ہیں۔ عورتیں' بوڑھے بچے سب اسی طرح اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم جاپانیوں کے جہنم سے نکل آئی ہو۔"

زاہدہ نے سر جھکا لیا۔ جاپانیوں کے ذکر سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ میں نے فوراً بات کا رخ بدل کر کہا:۔

"ویسے میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ تم اتنی ہمت سے کام لو گی۔ جس طرح تم میرے ساتھ ان خطرناک اور دشوار گزار جنگلوں میں پیدل چل رہی ہو' تمہاری جگہ اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو حوصلہ ہار بیٹھتی۔"

زاہدہ کے چہرے پر پہلی بار میں نے ہلکی سی مسکراہٹ آتے دیکھی۔ اس نے ہاتھ سے ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھے خود یقین نہیں تھا کہ میں اتنی ہمت کر لوں گی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

میں نے تھیلی میں سے چنے نکال کر زاہدہ کو دیئے۔۔۔

"تھوڑے سے کھا لو۔ یہاں اس کے سوا کوئی چیز کھانے کو نہیں ملے گی۔"

زاہدہ خاموشی سے کھانے لگی۔ میں جنگل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر آسمان ابر آلود نہ ہوتا اور سورج نکلا ہوتا تو میں سمت کا صحیح اندازہ لگا سکتا تھا۔ مگر سورج نظر نہیں آ رہا تھا۔ بندروں اور ہاتھیوں نے ہمیں سیدھے راستے سے تھوڑا ترچھا کر دیا تھا۔ پھر بھی مجھے امید تھی کہ اس جنگل میں ہمیں مہاجرین کا کوئی نہ کوئی قافلہ ضرور مل جائے گا۔ اگر قافلہ نہ ملا تو قافلہ جس راستے سے گزرا تھا' اسکا سراغ ضرور مل جائے گا۔ زاہدہ کو پیاس لگ رہی

تھی۔ پیاس مجھے بھی لگ رہی تھی۔ مگر پانی وہاں کہیں نہیں تھا۔ میں نے کچھ فاصلے پر ناریلوں کے درختوں کا جھنڈ دیکھا۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

”شاید ان درختوں کے نیچے گرے پڑے کچھ ناریل مل جائیں۔ ہم ان کا پانی پی کر پیاس بجھا سکتے ہیں۔“

میں ناریل کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ زمین پر چھ سات ناریل گرے ہوئے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے سارے ناریل اٹھا کر جھولی میں ڈالے اور زاہدہ کے پاس لے آیا۔ ہم نے ناریل پر ناریل مار کر انہیں توڑا۔ ان کا ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر پیاس بجھائی اور ان کے اندر جو گودا تھا' وہ بھی کھرچ کر کھایا۔

میں نے ہنس کر کہا:۔

”تمہیں یاد ہے لاہور میں ناریل کی گری ریڑھیوں پر کتنی مہنگی بکا کرتی ہے۔ یہ سارا علاقہ ناریل کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔“

ناریل کے پانی اور گودے نے ہمیں کافی توانائی دی۔ ہم اٹھے اور اللہ کا نام لے کر سامنے والی پہاڑیوں کی طرف چل دیئے۔ یہ پہاڑیاں زیادہ دور نہیں لگ رہی تھیں۔ مگر کافی دیر تک چلنے کے بعد محسوس ہوا کہ پہاڑیوں کا فاصلہ ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تھا۔ پہاڑیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ مگر ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان چلنے کے لئے قدرتی راستہ بنا ہوا تھا جس پر گھاس اگی تھی۔ یہ گھاس کہیں سبز اور کہیں سوکھی ہوئی تھی۔ جب ہم ان پہاڑیوں کے اندر داخل ہوئے تو اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم آگے جا رہے ہیں یا ان پہاڑیوں کے اردگرد ہی گھوم رہے ہیں۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"میں ٹیلے کے اوپر چڑھ کر دیکھتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔"

میں ایک پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا۔ چوٹی پر جا کر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ واقعی ہم پہاڑیوں کی بھول بھلیوں میں کھو چکے ہیں۔ میں نے سامنے کی جانب دیکھا۔ اس طرف پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا اور آگے ایک چھوٹا سا کھلا گھاس کا میدان تھا۔ میدان کے دوسرے کنارے پر درختوں کی قطار کھڑی تھی۔ لگتا تھا کہ وہاں سے پھر جنگل شروع ہو رہا ہے۔ مجھے پوری امید تھی کہ اس جنگل میں کہیں نہ کہیں کوئی قافلہ مل جائے گا۔

میں ٹیلے سے اتر کر زاہدہ کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ ہم تو پہاڑیوں کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے تھے۔ پھر میں نے پہاڑی کے اوپر کھڑے ہو کر جس راستے کو دیکھا تھا اس کے اندازے کے مطابق زاہدہ کو لیکر ایک ٹیلے کے عقب میں آ گیا۔ یہاں پتلا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس راستے سے گزر کر ایک اور ٹیلے کو عبور کیا اور ہم کھلے میدان میں نکل آئے۔ دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ میدان میں بھورے رنگ کی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ زاہدہ نے دور سے جنگل کے درختوں کی دیکھا اور تشویش بھرے لہجے میں کہا:۔

"اب ہم اس جنگل میں جائیں گے۔"

میں نے کہا:۔

"اسی جنگل میں تو ہمیں قافلہ ملے گا۔ فکر نہ کرو۔ بس ذرا مزید ہمت اپنے اندر پیدا کر لو۔"

اب ہم جس جنگل میں داخل ہوئے۔ یہاں سب سے پہلے بانسوں کے درخت شروع ہوتے تھے۔ یہ درخت اتنے گھنے تھے کہ ہمیں ان کے درمیان راستہ بنا کر چلنا پڑتا تھا۔ بانس کا درخت صرف ایک تنے پر مشتمل نہیں ہوتا۔ یہ ساتھ ساتھ اگے ہوئے کتنے ہی موٹے موٹے بانس ہوتے ہیں جن کا اوپر جا کر ایک جھاڑ سا بن جاتا ہے۔ اس جھاڑ کی چھاؤں میں بھی جگہ جگہ بانس کی کونپلیں یا بانس کی پتلی پتلی شاخیں زمین سے باہر نکلی ہوتی ہیں۔ بانس کا پودا بڑی تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس لئے بانس کے درخت کے نیچے رات کو سونا سخت خطرناک ہوتا ہے۔ آدمی اگر غلطی سے جنگل کے کسی گھنے بانس کے درخت کے نیچے سو جائے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ بانس کی کوئی پتلی کونپل زمین میں سے اچانک نکل کر سوتے ہوئے آدمی کے جسم سے آر پار ہو جائے۔

ان درختوں میں روشنی بھی کم ہو گئی تھی۔ مگر میں زاہدہ کو لے کر درختوں کی شاخوں کو ہٹاتا گزرتا چلا گیا۔ فاصلہ بڑی آہستہ آہستہ طے ہو رہا تھا۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد بانس کے درختوں کا سلسلہ کم ہو گیا اور سنبل کے درخت شروع ہو گئے۔ ان درختوں کے تنے اتنے بڑے بڑے تھے کہ تین آدمی اس کے پیچھے چھپ سکتے تھے۔ ان کی جڑیں دور دور تک زمین کے اوپر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم انہیں دیکھ دیکھ کر چل رہے تھے۔ دو تین بار زاہدہ تھک کر بیٹھ گئی۔ ان درختوں نے مجھے ایک بار پھر بھول بھلیوں میں ڈال دیا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کس سمت میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ تقریباً ہر درخت کے موٹے تنے اور زمین پر پھیلی ہوئی جڑوں پر سے گزرتے وقت غیر محسوس طور پر میرا رخ ذرا سا بدل جاتا۔

لیکن قدرت ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ اسکا ثبوت ہمیں بہت جلد مل گیا۔ جیسے ہی ہم سنبل کے گھنے درختوں میں سے باہر نکلے، ہمیں ایک کچا راستہ دکھائی دیا، جس پر کاغذ وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ میں دوڑ کر ان کاغذوں کے پاس گیا۔ یہ رنگون کے انگریزی اور اردو اخبار تھے، جن کے پھٹے ہوئے ٹکڑے راستے پر ادھر ادھر پڑے تھے۔ میں نے خوش ہو کر زاہدہ سے کہا:۔

"یہاں سے کوئی قافلہ گزرا ہے۔ لگتا ہے ہمیں قافلے کا سراغ مل گیا ہے۔"

زاہدہ نے بھی ان اخباروں کو غور سے دیکھا۔ کئی اخباروں کے گولے بنے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں سامان میں سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ کہنے لگی:۔

"ہمیں آگے چل کر معلوم کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کوئی قافلہ آگے آگے جا رہا ہو۔"

"آؤ میرے ساتھ۔"

ہم کچے راستے پر آگے کی طرف چلنے لگے۔ اس راستے کے دونوں جانب جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کچے راستے پر بھی کبھی گھاس اگی ہوئی ہو گی مگر اب کسی چیز کے اوپر سے بار بار گزرنے سے گھاس ختم ہو گئی تھی۔ گیلی جگہ پر ہمیں بیل گاڑی کے پہیوں اور بیلوں کے کھروں کے نشان دکھائی دیئے۔ میں نے بے اختیار کہا:۔

"زاہدہ! کوئی قافلہ آگے آگے جا رہا ہے۔ ہمیں تیز تیز چلنا چاہیے۔ تاکہ شام ہونے سے پہلے پہلے ہم قافلے کو پکڑ سکیں۔"

ہم نے اپنی رفتار تھوڑی تیز کر دی۔ ویسے بھی کچی سڑک پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ صرف ایک خطرہ تھا کہ اچانک کسی طرف سے کوئی شیر چیتا نہ نکل آئے۔ ایک جگہ کچھ چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ ایک پھٹا ہوا جوتا بھی سڑک کے کنارے اوندھا پڑا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مہاجرین کا کوئی قافلہ اس طرف سے گزرا ہے۔ زاہدہ سے تیز نہیں چلا جاتا تھا۔ پہلی بار اسے اس قسم کے حالات سے واسطہ پڑا تھا۔ ویسے بھی خاوند کے غم اور پے در پے مسائل نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ مجھے بھی اس کے ساتھ آہستہ چلنا پڑ رہا تھا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی تشویش نہیں تھی۔ قافلے کا سراغ مل جانے سے میرا آدھا فکر دور ہو گیا تھا۔ جاپانیوں کا بھی بظاہر وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کچا راستہ جنگل میں ایک طرف مڑ گیا۔ آگے ایک برساتی نالہ یا پہاڑی ندی آ گئی۔ یہ نشیب میں بہہ رہی تھی۔ اس کے اوپر شاید مقامی لوگوں نے بانسوں کو جوڑ کر ایک پل بنا دیا ہوا تھا۔ ہم پل پر سے گزرنے لگے تو وہ ڈولنے لگا۔ زاہدہ وہیں بیٹھ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پل عبور کرایا۔

میں حیران تھا کہ ابھی تک ہمیں کوئی گاؤں وغیرہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایک ڈر مجھے ضرور تھا کہ کہیں ڈاکو نہ آجائیں۔ میرے پاس ان سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی بندوق وغیرہ نہیں تھی۔ چاقو تک نہیں تھا۔ ندی کا پل پار کرنے کے بعد کچا راستہ جنگل کے پہلو سے ہو کر جاتا تھا۔ یہاں ایک جانب بھوری چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا۔ جنگل کے کنارے کیلے اور ناریل کے درخت اگے ہوئے تھے۔ زمین پر ہر جگہ کیلے کے چھلکے اور ٹوٹے ہوئے ناریل بکھرے ہوئے تھے۔ مہاجرین کے قافلے میں جو لوگ تھے، یہ کیلے اور ناریل انہوں نے کھائے ہوں گے۔ میں نے کیلے کا ایک گچھا توڑ کر

زرد رنگ کے تین چار کیلے الگ کیۓ۔ زاہدہ کو بھی کھلاۓ اور خود بھی کھاۓ۔ ایک ثابت ناریل گھاس پر پڑا تھا۔ اسے توڑا اور اسکا پانی تھوڑا خود پیا اور باقی زاہدہ کو پلایا۔ ہمارے جسم کی توانائی تھوڑی بحال ہو گئی۔ ہم دوبارہ آگے چل پڑے۔ رستہ کبھی چٹانوں کے درمیان آجاتا اور کبھی چٹانوں سے باہر نکل آتا تھا۔ آگے آکر چٹانوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور کچا رستہ دوبارہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ زاہدہ وہاں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔

"ابھی تک ہمیں قافلے والے لوگ کیوں نہیں ملے؟ میرا خیال ہے وہ شاید بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

میرا کام زاہدہ کو جھوٹی سچی تسلی دینا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں قافلے کا رستہ تو مل ہی گیا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی قافلہ ضرور مل جاۓ گا۔ بادلوں کی وجہ سے دن کی روشنی دھندلی تھی۔ جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا۔ درختوں کے تنے ساتھ ساتھ ضرور اگے ہوۓ تھے، مگر ان کے درمیان راستہ بنا ہوا تھا اور جھاڑیاں بھی فاصلے پر تھیں۔ درختوں نے اوپر جاکر چھت سی بنا رکھی تھی۔ یہ شاید دیاڑ کے درخت تھے۔ ان میں سے اکثر کے موٹے تنے پیازی رنگ کے تھے۔ ہم پھر اپنے نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہو گئے۔

یہ دھڑکا مجھے ضرور لگا ہوا تھا کہ کسی طرف سے کوئی ہاتھی ریچھ یا شیر چیتا اچانک نکل کر سامنے آگیا تو اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہو گی۔ درختوں کے تنے ستونوں کی طرح بالکل سیدھے اوپر تک چلے گئے تھے۔ ان کی شاخیں بلندی پر جاکر شروع ہوتی تھیں۔ جسکی وجہ سے ہنگامی صورتحال میں کسی

درخت پر پناہ نہیں لی جا سکتی تھی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جنگل میں کچھ دیر چلنے کے بعد اچانک ایک ہاتھی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ ہاتھی راستے میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے راستہ روک رکھا تھا۔ زاہدہ ڈر گئی۔ ڈر میں بھی گیا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہاتھی بڑے مزے سے بیٹھا ہے اور جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا مگر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔

میں نے زاہدہ کو آہستہ سے کہا:۔

"ہم ان درختوں کے پیچھے سے ہو کر گزرتے ہیں۔"

زاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر میں نے کچا راستہ چھوڑ دیا اور تناور درختوں کے پیچھے سے ہو کر دبے پاؤں چلنے لگا۔ زاہدہ بھی بڑی احتیاط سے چل رہی تھی۔ ہم ہاتھی سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے سے ہو کر گزر رہے تھے۔ ہاتھی کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ جب ہم ہاتھی کے بالکل متوازی پہنچے تو خدا جانے ہاتھی کو کیا ہوا کہ اچانک اس نے سونڈ اٹھا کر چیخ ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑا ہوتے ہی وہ ہماری طرف گھوم گیا۔ گھومتے ہی اس نے سونڈ اوپر اٹھائی اور اتنی زور سے چنگھاڑا کہ پورا جنگل گونج اٹھا۔ وہ ہماری طرف دوڑا۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"زاہدہ بھاگو۔"

ہم نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ہم جتنی تیز دوڑ سکتے تھے' دوڑ رہے تھے۔ مجھے زاہدہ کی فکر تھی کہ اگر وہ گر پڑی تو ہاتھی ہمارے سر کے اوپر پہنچ جائے گا۔ مگر زاہدہ نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور وہ میرے ساتھ بھاگتی چلی گئی۔ وہاں کوئی چٹان یا ٹیلہ بھی نہیں تھا کہ جس کے اوپر چڑھ کر ہم اپنی جان بچا لیتے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہاتھی ہمارے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اگرچہ

اس کے دوڑنے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی مگر وہ کسی بھی وقت ہمارے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ زاہدہ کا دم پھول گیا۔ میں بڑی مشکل سے اسے اپنے ساتھ بھگا رہا تھا۔ آگے جھاڑیاں آگئیں۔ زاہدہ کا دوپٹہ جھاڑیوں میں الجھ کر وہیں رہ گیا۔ میں بھی دوڑتا رہا اور اسے بھی اپنے ساتھ دوڑاتا رہا۔ مگر اب زاہدہ میں دوڑنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس درخت کی ابھری ہوئی جڑ سے ٹکرائی اور ہائے کہہ کر وہیں گر پڑی۔ میں نے گھبرا کر سب سے پہلے پیچھے دیکھا۔ مجھے ہاتھی نظر نہ آیا۔ جلدی سے زاہدہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ زاہدہ کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پیچھے دیکھا۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ ہاتھی کہیں نہیں تھا۔ خدا جانے وہ کس طرف نکل گیا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔

میں نے زاہدہ کو بتایا کہ ہاتھی اب ہمارا تعاقب نہیں کر رہا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ اس نے متوحش نگاہوں سے پیچھے دیکھا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کہنے لگی :۔

"وہ پھر آجائے گا۔"

میں نے کہا :۔

"اتنی دیر میں ہم آگے نکل جائیں گے۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ ہمت کرو"۔

زاہدہ میرا بازو تھام کر چلنے لگی۔

اس بھاگ دوڑ میں جنگل میں ہم جس رستے پر چل رہے تھے' اس راستے سے بھٹک گئے تھے۔ ہم جنگلی جھاڑیوں کے درمیان آگئے تھے۔ میں نے ایک جگہ رک کر سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اور پھر زاہدہ کو لے

کر دیودار کے اونچے اونچے درختوں کی طرف چل پڑا۔ خدا نے ہماری رہنمائی کی اور ہم ایک بار پھر کچے رستے پر آگئے۔ اب ہم بہت تھک گئے تھے۔ ایک جگہ درختوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ تھی' جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم یہاں بیٹھ گئے۔ زاہدہ نے کہا:۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں پانی کہیں نہیں تھا۔ ناریل کا کوئی درخت بھی نظر نہ آیا۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"یہاں شاید پانی کہیں نہیں ہے۔ چلتے ہیں۔ آگے شاید کہیں پانی مل جائے۔"

اور ہم ایک بار پھر چل پڑے۔

جنگل کا تصور ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ وہاں درختوں کے نیچے چشمے بہہ رہے ہوں گے۔ جگہ جگہ پھول کھلے ہوں گے۔ سبز گھاس ہوا میں لہرا رہی ہوگی۔ جگہ جگہ پھولدار درخت ہوں گے۔ یہ تصور بالکل گمراہ کن ہے۔ جنوبی ایشیا کے مرطوب جنگل اتنے خطرناک ہیں کہ اگر کوئی عمر قید بھگتنے والا قیدی جیل سے فرار ہو کر ان جنگلوں میں نکل آئے تو دوبارہ جیل جانے کی دعا مانگے گا۔ سب سے زیادہ تکلیف جنگل میں پانی کی ہوتی ہے۔ میلوں چلتے جائیں' پانی پینے کو کہیں نہیں ملے گا۔ چنانچہ رنگون سے مہاجرین کے جو قافلے ان جنگلوں میں پیدل چلے تھے' ان میں سینکڑوں لوگ پیاس کی وجہ سے مر گئے تھے۔ میں چل بھی رہا تھا اور دل میں دعا بھی مانگ رہا تھا کہ یا اللہ کہیں ناریل کا کوئی درخت ہی مل جائے اور اسکے نیچے کچھ ناریل بھی گرے ہوئے ہوں۔ کیونکہ درخت پر لگے ہوئے ناریلوں کو اتارنا بھی جان جوکھوں کا کام ہوتا

ہے۔ ہم چلتے چلے گئے۔ نہ پانی کہیں نظر آیا نہ ناریل کا کوئی درخت ملا۔ رستے پر کہیں کہیں چیتھڑے، کاغذ اور بیلوں کا گوبر ضرور دیکھنے میں آ جاتا تھا، جس سے ہمارے حوصلے قائم تھے کہ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔

اچانک زاہدہ ہلکی سی چیخ مار کر میرے پیچھے ہو گئی۔ میں سمجھا اس نے کوئی سانپ دیکھ لیا ہے۔ وہ جھاڑیوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ جھاڑیوں میں سے دو انسانی پاؤں باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ یہاں کیوں پڑا ہے۔ میں زاہدہ کو پیچھے کھڑا کر کے جھاڑیوں کے قریب آیا۔ شاخوں کو ایک طرف ہٹایا اور دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی، زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں، میں اس پر جھکا تو میرے خون میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ بوڑھا مر چکا تھا اور اس کے چہرے پر کالے رنگ کی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور زاہدہ کا بازو پکڑ کر اسے آگے لے گیا۔

”کون تھا؟“۔ زاہدہ نے چلتے چلتے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“

میں چلتا گیا۔ زاہدہ سمجھ گئی تھی۔ کہنے لگی:۔

”کسی کی لاش تھی؟“

”ہاں“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ بدنصیب بوڑھا پیدل چلنے والوں کے قافلے میں شامل تھا۔ کمزوری کی وجہ سے قافلے سے پیچھے رہ گیا اور آخر ان جھاڑیوں میں گر کر دم توڑ گیا۔“

ہم دونوں پر ایسی دہشت طاری ہو گئی کہ کافی دیر تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔

دن کی روشنی کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔

چلنے سے ہمارے پاؤں سوج گئے تھے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایک تھکاوٹ اور اوپر سے پیاس نے برا حال کر رکھا تھا۔ زاہدہ بڑی ہمت سے میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اچانک ایک جگہ اس کا پاؤں گھاس میں دھنس گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے پاؤں نکالنے کے لئے زور ڈالا تو اسکی ٹانگ پنڈلی تک گھاس کے اندر چلی گئی۔ میں نے اسے نکالنا چاہا تو میرا پاؤں بھی زمین میں دھنس گیا۔

"زاہدہ ہلنا مت۔ یہ دلدل ہے۔"

مجھے برمی دوست کامریڈ نی ون کی بات یاد آگئی۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر دلدل میں پاؤں پھنس جائے تو زور بالکل نہ لگانا۔ اسی وقت زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جانا اور اس طرح ہاتھ چلانا جیسے آدمی پانی میں تیرتا ہے۔ صرف اسی صورت میں تم دلدل سے نجات حاصل کر سکو گے ورنہ دلدل تمہیں نگل جائے گی۔ میں نے سب سے پہلے زاہدہ کو کہا کہ وہ اوندھے منہ لیٹ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ہمارا جسم جو دلدل میں نیچے اترنا شروع ہو

گیا تھا' وہ رک گیا۔ پھر میں نے زاہدہ سے کہا کہ وہ گھاس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچے۔ اس نے گھاس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اسکی ٹانگ دلدل سے باہر نکل آئی۔ اسی طرح میں نے بھی اپنا پاؤں دلدل سے باہر نکال لیا۔ زاہدہ نے کہا:۔

"میرا جوتا نیچے رہ گیا ہے۔"

جوتا اس وقت اہم ترین شے تھی۔ جوتے کے بغیر اس جنگل میں ہم دس قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ میرا تسموں والا فلیٹ شو تھا۔ وہ میرے پاؤں میں ہی رہا۔ زاہدہ کی چمڑے کی جوتی تھی۔ اس کا ایک پاؤں دلدل میں ہی رہ گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنا رخ دوسری طرف کیا جہاں زاہدہ نے اپنی ٹانگ دلدل سے باہر کھینچی تھی وہاں ایک سوراخ پڑ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دلدل ایسی دلدل نہیں تھی جو اوپر نیچے ہوتی ہے۔ میں نے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر سوراخ کے اندر سے جوتا باہر نکال لیا۔ میری ہدایت کے مطابق زاہدہ اسی طرح زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ میں بھی اوندھا پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"جس طرح پانی میں تیرتے ہیں' اسی طرح تیر کر آگے نکلو"۔

زمین پر چند قدم تک ہم تیرتے ہوئے بلکہ رینگتے ہوئے نکل گئے۔ جب سخت زمین آگئی تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کپڑے سے زاہدہ کے پاؤں اور پنڈلی پر لگا ہوا دلدل کا کیچڑ صاف کیا۔ اس کو جوتا پہنایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ زاہدہ نڈھال ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مجھ سے آگے نہیں چلا جاتا۔"

اور وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے دیا اور رونے لگ پڑی۔ اس کا رونا حق بجانب تھا۔ میں سوائے جھوٹی تسلیاں دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ زاہدہ کو یہاں بٹھا کر خود آگے جاتا ہوں۔ شاید آگے کہیں پانی کا کوئی سراغ مل جائے یا ناریل کا کوئی جھنڈ ہی نظر آ جائے۔ میں نے زاہدہ کو وہاں بیٹھے رہنے کی تاکید کی۔ چنے والی تھیلی اس کے قریب رکھ دی اور خود کچے راستے پر آگے چل پڑا۔ یہ کچا راستہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا بلکہ رنگون سے نکلے ہوئے بے خانماں قافلوں نے چل چل کر یہاں راستہ بنا دیا تھا۔ کچھ دور چلا ہوں گا کہ درختوں کے نیچے ایک انسان درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں جلدی سے اسکی طرف بڑھا کہ اس سے مدد طلب کروں۔ قریب جا کر دیکھا تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ آدمی مر چکا تھا اور اسکے سارے بدن پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔

میں تیز تیز چلتا آگے نکل گیا۔ خدا جانے یہ کون شخص تھا ظاہر ہے قافلے میں سفر کر رہا ہو گا۔ بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر یہاں بیٹھا اور یہیں اس کا دم نکل گیا۔ تھوڑی دور تک چلتے رہنے کے بعد راستہ بائیں جانب درختوں کی طرف گھوم گیا۔ میں وہیں رک گیا۔ کیونکہ آگے گھنا جنگل شروع ہو رہا تھا۔ میں وہیں سے واپس پلٹا اور زاہدہ سے آکر کہا۔

"پانی تو کہیں نہیں ملا۔ تمہارے خیال سے آگے نہیں گیا۔ آگے چلتے ہیں۔ شاید کوئی برساتی نالہ مل جائے"۔

ہم چلنے لگے۔ جب اس درخت کے قریب سے گزرے جہاں میں لاش دیکھ چکا تھا تو میں نے زاہدہ کو بتا دیا کہ اس طرف ایک اور لاش پڑی ہے ادھر مت دیکھنا۔ وہ سہم گئی مگر میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اس نے لاش کی

طرف نہ دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رنگون سے جو لوگ پیدل نکل پڑے تھے' وہ راستے میں بھوکے پیاسے مر رہے تھے اور انہیں طرح طرح کی بیماریوں نے بھی آن گھیرا تھا۔ زیادہ تر لوگ پیچش اور ملیریا کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر دم توڑ دیتے تھے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر نکل سکے تھے۔ اگر صرف جاپانیوں کی بمباری کا عذاب ہی ہوتا تو لوگوں کو اتنا موقع ضرور مل جاتا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ سامان لے لیتے۔ مگر ہوا یہ تھا کہ مقامی لوگوں نے جب پنجابیوں اور دوسرے ہندوستانی باشندوں کی دکانوں کو لوٹنا اور ان کے گھروں پر حملے کرنے شروع کر دیئے تو وہاں ایک بھگدڑ سی مچ گئی تھی اور لوگ بدحواسی میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ہم قدم قدم چل رہے تھے۔

پیاس کے مارے میرا بھی حلق خشک ہو رہا تھا' مگر مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ مجھے زاہدہ کا خیال لگا ہوا تھا کہ کہیں پیاس کی وجہ سے نڈھال ہو کر گر پڑی تو مشکل ہو جائے گی۔ اب ہم ایک بار پھر جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ جنگل بھی کافی گھنا تھا۔ یہاں درخت ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے مگر قافلے والوں نے وہاں ایک پگڈنڈی سی بنا دی تھی۔ اس پگڈنڈی پر بھی ہمیں بہت سا سامان ادھر ادھر گرا پڑا ملا۔ کہیں کوئی خالی ٹرنک اوندھا پڑا تھا۔ کہیں پھٹے پرانے چیتھڑے پڑے ہوئے تھے۔ لوگ اپنا فالتو سامان راستے میں پھینکتے ہوئے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے دن کی روشنی شام کے سرمئی دھندلکوں میں تبدیل ہونے لگی۔ جنگل کے گھنے پن کی وجہ سے وہاں زیادہ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ زاہدہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور جھک کر چل رہی تھی۔ اب پھر مجھے

جنگلی درندوں کا خوف دامن گیر ہوا۔ رات کے وقت درندے خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اب ایسا ہوا کہ تھوڑی دور تک چلنے کے بعد جنگل کے درخت ختم ہوگئے اور آگے پانی نظر آیا۔ میں نے زاہدہ سے کہا۔

"زاہدہ! آگے پانی ہے۔"

زاہدہ کے تن مردہ میں بھی جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس کے قدم بھی تیز ہوگئے۔ جہاں جنگل کے درخت ختم ہوتے تھے' وہاں درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ندی کا پانی چلو میں بھر کر زاہدہ کے منہ کے پاس کیا۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور اسکے گلے سے گڑگڑاہٹ کی آواز نکلی اور سارا پانی باہر آگیا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔

"پانی میں زہر ملا ہوا ہے۔"

اور وہ وہیں لیٹ گئی۔ میں نے ندی کا پانی تھوڑا سا منہ میں ڈالا اور جلدی سے تھوک دیا۔ پانی کڑوا تھا۔ ڈوبتے دن کی سرمئی روشنی میں' میں نے ندی کے پانی کو غور سے دیکھا۔ پانی کا رنگ گہرا سبزی مائل تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ سمندر کا پانی ہے۔ میں نے زاہدہ سے کہا۔

"پانی کڑوا اس لئے ہے کہ یہ سمندر کا پانی ہے۔ اس میں زہر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔"

زاہدہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فکر مند ہو کر کہنے لگی۔

"کیا سمندر آگیا ہے؟۔"

میں نے کہا۔

"سمندر نہیں آیا۔ سمندر کا پانی ایک کھاڑی کی شکل میں جنگل میں آگیا ہوا ہے۔"

سمندر کے پانی کو دیکھ کر اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی کہ صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ اور مہاجرین کے جو قافلے آگے آگے پیدل جا رہے ہیں' وہ بھی صحیح راستے پر تھے۔ رنگون کے جنوب میں سفر کرتے ہوئے دریائے ایراوتی میں سفر کرنا پڑتا ہے اور سمندر بہت آگے جا کر آتا ہے۔ لیکن برما کے شمال مغربی علاقے میں خلیج بنگال کا سمندر لگتا ہے۔ اسی طرح برما کے جنوب مشرق میں خلیج مرتبان کا سمندر ہے۔ اس حساب سے ہم برما کے شمال کی طرف جا رہے تھے اور اس طرف پروم کا شہر تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ مہاجرین کے قافلے پروم سے ہو کر جا رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیل میں نے زاہدہ کو بتائی تو اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر بھی امید کی ہلکی سی کرن نظر آنے لگی۔ مگر پیاس نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور آنکھوں کے گرد حلقے مزید گہرے ہونے لگے تھے۔ اب ہمیں سمندر کی کھاڑی پار کر کے دوسری طرف کے جنگل میں داخل ہونا تھا۔ وہاں کھاڑی کے کنارے پر زمین کیچڑ والی تھی اور ایسے نشان تھے جیسے وہاں سے لوگ اور بیل وغیرہ گزرے ہوں۔ یہاں بھی جھاڑیوں میں چیتھڑے اور خالی ڈبے وغیرہ الجھے ہوئے تھے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مہاجرین نے یہ کھاڑی کس طرح پار کی تھی۔ اتنے لوگوں کا تیر کر جانا ناممکن تھا۔ جبکہ ساتھ بچے بوڑھے اور عورتیں بھی ہوں۔ مجھے خیال آیا' ہو سکتا ہے کہ یہاں انہیں ملاح مل گئے ہوں جو پیسے لے کر کھاڑی پار کرانے آگئے ہوں۔ اسکا مطلب تھا کہ وہ ملاح دوبارہ یہاں آئیں گے۔ کیونکہ رنگون سے مہاجرین کے قافلے چلے آ رہے تھے۔ ابھی میں

یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ کھاڑی کے دوسرے کنارے سے مجھے شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ایک کشتی نما چیز اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

میں نے زاہدہ سے کہا۔

"شاید کوئی کشتی والا آرہا ہے"۔

یہ واقعی کشتی تھی۔ قریب آئی تو دیکھا کہ یہ ایک بڑی کشتی تھی اور برمی ملاح اسے چلا رہے تھے۔ انہوں نے کشتی میں کھڑے کھڑے ہمیں ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں کہا۔

"ادھر یاجو کو؟"

میں نے بھی اونچی آواز میں کہا۔

"ہاں! ادھر یاجو کو"۔

ایک ملاح نے کشتی میں آنے کا اشارہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ملاح قافلے کے لوگوں کو پیسے لے کر پار اتارتے تھے۔ زاہدہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں بیٹھنے لگا تو ملاح نے کہا۔

"پگار؟"۔

مطلب کہ کرایہ نکالو۔ میں نے پوچھا۔

"کتنا تالی؟"۔

اس نے چار بار تالی بجا کر کہا۔

"چار تالی"۔

مطلب بیس روپیہ۔ یعنی ایک تالی کے پانچ روپے۔ اس زمانے کے بیس روپے آج کے پانچ سو روپے کے برابر ہوتے تھے۔ میں نے کمر سے نکال

کر جو روپے پتلون کی جیب میں رکھے ہوئے تھے' ان میں سے بیس روپے نکال کر انہیں دیئے اور پانی مانگا۔ برمی ملاح بولا۔

"ادھر پاجو ملے گا"۔

یعنی پانی دوسرے کنارے پر پہنچ کر ملے گا۔ سمندری کھاڑی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ کشتی دس پندرہ منٹ میں دوسرے کنارے پر جا لگی۔ وہاں ان ملاحوں نے ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ ایک ملاح جھونپڑی کے اندر گیا اور تام چینی کے بڑے پیالے میں پانی بھر کر لے آیا۔ میں نے سب سے پہلے زاہدہ کو پانی پلایا۔ لیکن اسے زیادہ پانی نہ پینے دیا۔ پھر خود چار پانچ گھونٹ پیئے۔ پانی پی کر ہم دونوں کو جیسے ہوش آگیا۔ میں نے برمی ملاح سے قافلے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اور ناقابل فہم شکستہ ہندوستانی میں مجھے جو کچھ سمجھایا' اس کا مطلب یہ تھا کہ رنگون سے آنے والے لوگوں کے قافلے اس طرف بھی گزرتے ہیں اور شمال مشرق کی جانب' یعنی اکیاب جانے والے روٹ پر سے بھی گزر رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس طرف سے قافلے آنا تقریباً بند ہو گئے ہیں۔ دوسرے تیسرے دن پچاس ساٹھ آدمیوں کا قافلہ آجاتا ہے۔ میں نے جاپانیوں کے بارے میں پوچھا کہ آگے جاپانی فوج تو نہیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ آگے جنگل میں کوئی جاپانی نہیں ہے۔ اس وقت رات ہو رہی تھی۔ زاہدہ زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"ہم رات کو جنگل میں سفر نہیں کریں گے"۔

بات زاہدہ نے ٹھیک کی تھی۔ میں نے سوچا کہ جنگل میں جا کر جو ہم کسی جگہ رات بسر کرنے کا بندوبست کریں گے تو کیوں نہ اس ملاح سے پوچھا

جائے۔ ہو سکتا ہے ان کے ہاں رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ مل جائے۔ جب میں نے کچھ لفظوں اور کچھ اشاروں سے اس کے آگے اپنا مطلب بیان کیا تو اس نے بتایا کہ ان کے پاس یہ ایک ہی جھونپڑی ہے جس میں وہ دونوں رات کو سوتے ہیں۔ ہاں آگے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے' وہاں ہم لوگوں کو رات گزارنے کو جگہ مل جائے گی۔ میں نے زاہدہ کو یہ بتایا تو وہ کہنے لگی۔

"خدا کرے کہ گاؤں زیادہ دور نہ ہو۔"

میں نے کہا۔

"اب یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ خدا کا نام لے کر چل پڑتے ہیں۔"

چنانچہ ہم اٹھے اور شروع رات کے ملگجے اندھیرے میں جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہاں درخت فاصلے فاصلے پر اگے ہوئے تھے۔ مگر ان درختوں پر اتنی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں کہ اوپر ایک چھت بن گئی تھی۔ راستے میں ہمیں بندروں کی آوازیں آئیں جو درختوں پر اچھلتے کودتے شور مچا رہے تھے۔ چڑیوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے درختوں کا فاصلہ زیادہ ہونے لگا۔ پھر ایک کھلا مگر چھوٹا سا میدان آ گیا' جہاں ایک طرف چند ایک جھونپڑے دکھائی دیئے۔ یہاں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک دو جھونپڑیوں میں آگ بھی روشن تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔ یہ چھ سات جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا برمی گاؤں تھا۔ ہمیں دیکھ کر عورتیں' مرد اور بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ عورتوں کے ہاتھوں میں کاغذ تھے جن میں بھنے ہوئے چنے اور زرد کیلے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ قافلے والوں کو یہاں سے گذرتے وقت بھنے ہوئے چنے اور جنگلی زرد کیلے کھانے کو دیتے ہیں۔ یہ

بڑے نیک دل برمی لوگوں کا گاؤں تھا۔ مگر افسوس کہ وہ ہماری زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان بھی نہیں بول سکتے تھے۔ اشاروں سے باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ہم رات بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لئے ایک جھونپڑی خالی کر دی۔ ہمارے منہ ہاتھ دھلائے۔ نمکین چاولوں اور مچھلی کے سالن سے ہماری تواضع کی۔ رات کو میں اور زاہدہ جھونپڑی میں گھس گئے۔ وہاں زمین پر خشک گھاس پھونس کے اوپر دری بچھی ہوئی تھی۔ دو تکئے بھی رکھے تھے۔ ہم کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ زاہدہ کو اپنے خاوند کا جو غم لگا تھا' وہ اب کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ بلکہ اس سے بڑی مصیبت نے خاوند کی جدائی کے غم کو کم کر دیا تھا۔ اس نے جاپانی سپاہیوں کی قید میں جو وقت گذارا تھا' اس سے متعلق نہ میں نے اس سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اس نے کوئی بات کی۔ وہ زیادہ تر یہی پوچھتی رہی کہ ابھی ہمیں ان جنگلوں میں کتنی دور چلتے رہنا ہو گا۔ راستے میں کہیں جاپانی فوجی تو نہیں پکڑ لیں گے۔ پھر وہ لاہور میں اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں کو یاد کرنے لگی اور اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس دوران اس نے اپنے خاوند کو بالکل یاد نہ کیا۔ ہو سکتا ہے دل میں اسے خاوند کی موت کا غم ہو مگر وہ اسے زبان پر نہیں لائی۔ میں نے کہا:

"زاہدہ! وہ بھی کیا دن تھے جب ہم لاہور میں راتوں کو تمہارے مکان کی چھت پر ملا کرتے تھے۔ ریلوے لائن والا قبرستان یاد ہے؟ وہاں بھی دوپہر کو ملا کرتے تھے۔"

زاہدہ نے آہستہ سے کہا:۔

"یاد ہے۔"

پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی:

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں اپنا تکیہ لے کر جھونپڑے کی سامنے والی دیوار کی طرف ہو گیا۔ زاہدہ سمٹ کر وہیں تکئے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ جھونپڑی میں ناریل کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ میں نے چراغ کی بتی نیچی کر دی اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ ذہن کو طرح طرح کے پریشان کن خیالات نے گھیر لیا۔ کبھی خیال آتا کہ کلکتے تک دشوار گذار جنگلوں میں اتنا لمبا سفر کیسے طے ہو گا۔ راستے میں کہیں جاپانیوں نے پکڑ لیا تو کیا ہو گا؟ جاپانی فوج تو برما میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اگر رنگون کے مہاجرین کا کوئی قافلہ نہ ملا تو کیا ہو گا؟ کیا میں زاہدہ کو زندہ سلامت بچا کر لاہور اس کے والدین کے پاس لے جا سکوں گا؟ شاید زاہدہ بھی دوسری طرف منہ کر کے لیٹی یہی سوچ رہی تھی۔ خدا جانے کب مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

جب آنکھ کھلی تو زاہدہ جھونپڑی میں نہیں تھی۔ چراغ بجھا ہوا تھا۔ جھونپڑی میں بانس کی درزوں میں سے دن کا اجالا اندر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر چاروں طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر چاروں طرف دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ زاہدہ دیہاتی برمی عورتوں کے پاس جھونپڑی کے باہر بیٹھی تھی۔ چولہے کے اوپر دیگچی میں کچھ پک رہا تھا۔ ان لوگوں نے ہماری اتنی خاطر مدارت کی کہ ہمارا وہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر وہاں زیادہ دیر بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی ہم نے تین دن ان کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران اپنے کپڑے دھو کر صاف ستھرے کئے۔ اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال

کی۔ اب یہ لوگ اشاروں میں ہمارا مطلب فوراً سمجھ جاتے تھے۔ اور ہم بھی ان کا مطلب سمجھ لیتے تھے۔ ان کے ایک بزرگ برمی نے جس کا سر منڈا ہوا تھا اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا کہ جنگل کی ایک کم دشوار پگ ڈنڈی پر ایک دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد ہمیں بائیں جانب ایک بڑی نہر کا کنارا ملے گا۔ قافلے یہاں سے کشتیوں میں سوار ہو کر ڈی پھونگ تک جاتے ہیں جو ایک دن کا کنارے کے ساتھ ساتھ سفر ہے۔ ڈی پھونگ سے پھر یہ قافلے جنگل میں داخل ہو جاتے ہیں اور شمال کی طرف اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

جب ہم جانے لگے تو انہوں نے ایک بڑی تھیلی میں ہمیں بھنے ہوئے چنے اور تھوڑے سے زرد کیلے بھر کر ساتھ کر دیئے۔ برما میں رنگون کے زرد کیلے کافی چھوٹے چھوٹے مگر بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں ہمارے ہاں کے سبز کیلوں کی خوشبو بالکل نہیں ہوتی۔ میں نے ان کی ایک بڑی عمر کی خاتون کو پچاس روپے پیش کئے جو اس نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد لے لئے۔ یہ ان کے احسان کا بدلہ بالکل نہیں تھا۔ میں ان کی احسان مندی کا اس سے زیادہ اور کیا اظہار کر سکتا تھا۔ روپوں کی ہمیں آگے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ لوگ ہمیں جنگل میں دور تک چھوڑنے آئے۔ جب تک ہم ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئے' وہ وہیں کھڑے رہے۔ پھر وہ ہماری نگاہوں سے بھی اوجھل ہو گئے۔

آگے ایک بار پھر ہیبت ناک جنگل ہمیں نگلنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ گاؤں والوں نے ہمیں جو راستہ سمجھایا تھا' ہم اسی کے مطابق چل رہے تھے۔ ہمارا روٹ پروم شہر کے ملحقہ جنگل سے گذر کر اکیاب تک تھا۔ پروم

پروم سے اکیاب بڑا طویل اور دشوار گذار سفر تھا۔ بیچ میں خطرناک دلدلیں، زہریلے سانپوں اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگل، دریا، جھیلیں اور اراکان کی پہاڑیوں کا سلسلہ بھی آتا تھا۔ اکیاب سے ہمیں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بنگال کے سرحدی اور ساحلی شہر کاکسز بازار میں داخل ہو جانا تھا۔ لکھنے اور بتانے میں یہ فاصلہ بڑا آسان تھا مگر یہ ایک ایسا طویل سفر تھا کہ جگہ جگہ موت کا سامنا تھا۔ لیکن ہمیں اس موت کی وادی میں سے ہر حالت میں گذرنا تھا اور زندہ بھی رہنا تھا۔ دوپہر تک ہم گھاس اور جنگلی جھاڑیوں کے میدان میں چلتے رہے۔ راستے میں ہمیں ایک پہاڑی چشمہ ملا تو وہاں بیٹھ کر ہم نے تھوڑے سے چنے اور ایک دو کیلے کھائے۔ پانی میں پاؤں ڈال کر دھوئے اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

وہ ہیبت ناک جنگل قریب آ گیا تھا جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس جنگل کے قریب پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ وہاں کوئی سیدھی سڑک تو تھی نہیں کہ جلدی فاصلہ طے ہو جاتا۔ کئی بار چھوٹے ٹیلے راستے میں آ جاتے اور ہمیں ان کے گرد چکر کاٹ کر آگے جانا پڑتا۔ جب گھنا جنگل شروع ہوا تو زاہدہ نے کہا:۔

"رات ہو رہی ہے۔ جنگل میں رات بسر کرنے کی بجائے ہم یہیں کھلی جگہ پر کہیں رات کاٹ لیتے ہیں۔"

تجویز مناسب تھی۔ ہم نے وہیں ایک چھوٹی سی دریائی ندی کے پاس جگہ صاف کی اور بیٹھ گئے۔ کسی نہ کسی طرح رات کٹ گئی۔ اگلے دن بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن چڑھا تو ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ اس جنگل میں ہمیں دوبارہ وہ روٹ مل گیا جس پر سے مہاجرین کے قافلے

گذر کر پروم جا رہے تھے۔ جنگل میں درختوں کے درمیان لوگوں کے گذرنے سے راستہ بن گیا تھا۔ کہیں کہیں اس راستے پر قافلے والوں کی پھینکی ہوئی کوئی چیز نظر آتی تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ ہم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی لاش وغیرہ نہیں ملی تھی۔ جب تک ہم چل سکتے تھے' چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئے۔ جیسے جیسے ہم جنگل میں آگے بڑھ رہے تھے' جنگل گھنا ہو رہا تھا اور جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ایک جگہ مٹی کا ٹیلہ سا بنا ہوا تھا جس پر بانس کی کونپلیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہاں ایک کھوہ نظر آیا۔ ہم اس کے قریب سے گذرے تو میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر سے کسی درندے کے غرانے کی آواز آئی تو ہم ڈر کر دوڑ پڑے۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"یہ جنگلی ریچھ تھا زاہدہ!"

ہم جتنی دور تک بھاگ سکتے تھے' بھاگتے رہے۔ تھک گئے تو بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ ڈر یہی تھا کہ کہیں ریچھ ہمارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ مگر ریچھ نے غرانے تک ہی اکتفا کیا تھا۔ وہ کھوہ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ دوپہر کے وقت جنگل کا گھنا پن چھٹ گیا۔ قافلے کا روٹ بھی ذرا کھلا ہو گیا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ جنگل میں اندھیرا چھانے لگا۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ رات کسی درخت پر چڑھ کر گذاری جائے۔ کیونکہ جنگلی درندوں کا خطرہ تھا۔ ایک درخت پر ہم کسی نہ کسی طرح چڑھ کر اس کے دوشاخے پر بیٹھ گئے۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"ہمیں یہاں بیٹھ کر ہی رات بسر کرنی پڑے گی' مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں نیچے نہ گر پڑو۔"

زاہدہ بولی :۔"تم میری فکر نہ کرو۔ میں بیٹھ کر بھی رات گذار سکتی ہوں۔"

یہاں مچھروں نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں چیونٹیوں نے بھی کاٹنا شروع کر دیا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں درخت سے نیچے اترنا پڑا۔ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہیں ایک بہت بڑے درخت کے تنے کے پیچھے تھوڑی سی جگہ بنالی۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ میں آدھی رات تک جاگ کر پہرہ دوں گا' اس کے بعد تمہیں پہرہ دینا ہو گا۔ زاہدہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے لاہور میں گذرے ہوئے خوبصورت دن یاد دلادیئے۔ وہ مجھے پہلے والی زاہدہ لگنے لگی۔ میں نے اسے سلا دیا۔ میں تنے کے پیچھے پہرے پر بیٹھ گیا۔ پہرہ کیا دینا تھا۔ بس یہی دیکھتا رہا کہ کسی طرف سے کوئی شیر ہاتھی تو نہیں آرہا۔ اگر کوئی شیر ہاتھی آبھی جاتا تو ہم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ دوڑ کر اس درخت پر چڑھ جاتے جس پر سے ہم چیونٹیوں کی وجہ سے نیچے اتر آئے تھے۔ یہ درخت ہمارے قریب ہی تھا۔ میں بس خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یا خدا اگر کسی شیر' ہاتھی نے ادھر آنا ہی ہے تو ہمیں اتنی مہلت دے دینا کہ ہم دوڑ کر درخت پر چڑھ سکیں۔ وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ لگتا تھا رات جنگل میں آکر ٹھہر گئی ہے۔ کچھ دیر گذری ہو گی کہ زاہدہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے مچھر تنگ کر رہے تھے۔

جنگل میں بڑی ڈراؤنی خاموشی طاری تھی۔ اب ہم کچھ کچھ اس ڈراؤنی خاموشی کے عادی سے ہو گئے تھے۔ اب ہمیں رات کے وقت جنگل میں اتنا ڈر نہیں لگتا تھا۔ ڈر صرف زہریلے سانپوں اور جنگلی درندوں کا ہی تھا۔ ان کے بارے میں ہم بڑے محتاط تھے۔ تھوری دیر ہم باتیں کرتے رہے۔

زاہدہ کو نیند آنے لگی۔ آخر وہ عورت تھی۔ رنگون سے نکلنے کے بعد اب تک میرے ساتھ پیدل آ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ تم تھوڑی دیر جیسے بھی ہوتا ہے، سو جاؤ۔ میرے پاس ماچس تھی۔ سگریٹ پینا تو میں جیسے بھول ہی گیا تھا۔ سگریٹ میرے پاس نہیں تھی۔ گاؤں میں ایک سگار ضرور پیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر سے سوکھے پتے اور درختوں کی گری پڑی شاخیں اکٹھی کر کے انہیں آگ لگا دی۔ اس سے دھواں اٹھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے شعلے بھی نکلنے لگے۔ میں نے ان پر ایک طرف مٹی ڈال دی تاکہ شعلے زیادہ نہ ہوں اور دھواں ہی اٹھتا رہے۔ اس دھوئیں کی وجہ سے مچھر بھاگ گئے۔ لیکن زاہدہ اچھی طرح نہ سو سکی۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم دوبارہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

پھر نہ جانے کس وقت ہم باتیں کرتے کرتے وہیں دھوئیں کی ڈھیری کے پاس سو گئے۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ جنگل میں دن نکلا ہوا تھا۔ درختوں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ میں نے زاہدہ کو اٹھایا۔ وہ بھی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور حیران ہو کر پوچھنے لگی:

"کیا ہم سو گئے تھے؟"

میں نے کہا:۔ "ہاں۔ خدا کا شکر ہے کہ رات کو کوئی شیر چیتا ادھر نہیں آیا، ورنہ ہم اس وقت زندہ نہ ہوتے۔"

الاؤ کی آگ بجھ چکی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ہم نے ایک ایک کیلے اور تھوڑے چنے کھا کر ناشتہ کیا۔ پانی کا مسئلہ پھر سامنے تھا۔ پانی وہاں کہیں نہیں تھا۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ یہاں سے چل پڑتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں پانی

کہیں پانی مل ہی جائے گا۔ اور ہم قافلے کے راستے پر اللہ کا نام لے کر آہستہ آہستہ چل پڑے۔

کوئی ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں کے جھنڈ نظر آئے تو ہم ان کے نیچے گرے ہوئے ناریل اٹھالائے۔ انہیں توڑ کر ان کا پانی پیا اور کچی گری کھائی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر سانس لیا اور دوبارہ اپنے شاید کبھی نہ ختم ہونے والے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جنگل کے درخت کافی دور جاکر ایک بار پھر الگ الگ ہونے لگے تھے۔ اب جو درخت تھے' ان میں ناریل کے درخت زیادہ تھے۔ ایک جگہ ناریل کے درخت زمین پر کافی جھکے ہوئے تھے۔ ہوا میں کچھ نمی کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:

"شاید سمندر آرہا تھا۔"

مگر سمندر ابھی ہم سے کافی بلکہ بہت زیادہ فاصلے پر تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا جو جھیلوں' ندیوں اور کھاڑی کی شکل میں کہیں کہیں جنگل کے اندر آگیا ہوا تھا۔ جس طرح ایک سمندری کھاڑی ہم پیچھے چھوڑ کر آئے تھے' اسی طرح کی ایک اور کھاڑی آگئی۔ اس میں بھی سمندر کا پانی تھا جو پینے کا لائق نہیں تھا اور کڑوا تھا۔ کھاڑی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ اس کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک زنگ آلود چٹانیں ساتھ ساتھ باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان پر قافلے والوں نے بانس ڈال کر اوپر ناریل کی شاخیں بچھا کر ایک پل سا بنا دیا تھا۔ ہم نے اس پل پر سے گذر کر کھاڑی پار کی۔ دوسری جانب ایک چھوٹی سی وادی نظر آئی۔ یہاں کھیت بھی تھے اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ یہ وہ کھاڑی نہیں تھی جس کے بارے

میں گاؤں کے بزرگ برمی نے بتایا تھا کہ وہاں سے ہمیں کشتی میں سفر کرنا پڑے گا۔ زاہدہ کہنے لگی:

"اس نے تو کہا تھا کہ کھاڑی بڑی ہوگی۔ یہ تو چھوٹی سی تھی اور یہاں کوئی کشتی بھی نظر نہیں آ رہی۔"

تب مجھے یاد آیا کہ برمی بزرگ نے کہا تھا کہ سمندر کی بڑی کھاڑی سے قافلے والے مہاجرین کشتیوں میں سوار ہو کر کھاڑی میں ساحل کے ساتھ ساتھ ڈی پھونگ گاؤں تک جاتے ہیں۔ وہاں سے آگے ڈی پھونگ کا جنگل شروع ہو گا جو ہمیں پروم سے آگے اکیاب کے پہاڑی سلسلے تک لے جائے گا۔ کبھی کبھی ایسا لگتا کہ میں زاہدہ کو لے کر لاہور کبھی نہیں پہنچ سکوں گا۔ پھر جب خیال آتا کہ اس مصیبت میں صرف میں ہی مبتلا نہیں ہوں بلکہ یہ عذاب رنگون کے تقریباً بھی ہندوستانی باشندوں خاص طور پر پنجابی مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اور وہ سب لوگ اسی طرح بے خانماں و بدحال ان جنگلوں میں سے پیدل گذر رہے ہیں، تو دل کو کسی قدر ڈھارس بندھتی۔

آخر وہ بڑی کھاڑی بھی آ گئی جہاں سے ہمیں کشتی میں سوار ہونا تھا۔ یہاں بھی کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابھی تک ہمیں کوئی قافلہ نہیں ملا تھا۔ میں اس بات پر بھی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ابھی تک کسی برمی ڈاکو نے ہم پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ بھی میرے نزدیک یہی تھی کہ قافلے ایک دوسرے سے دور دور اور کافی فاصلے پر ہو گئے تھے اور چونکہ کافی دیر دیر کے بعد قافلوں کی ٹولیاں گذرتی تھیں، اس لیے ان جنگلوں میں برمی ڈاکوؤں نے رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے ڈی پھونگ کے جنگلوں میں کسی ڈاکو سے مڈبھیڑ ہو جائے۔

کھاڑی کے ساحل پر ایک طرف چھ سات پرانی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک برمی ملاح نے ہمیں دیکھا تو دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے ہندوستانی قافلے والوں کو ڈھوتے ہوئے تھوڑی بہت ہندوستانی زبان سیکھ لی تھی۔ آتے ہی بولا:

"ڈی پھونگ جانے سکتا۔۔۔؟"

میں نے کہا:۔"جانے سکتا۔"

اور ہم اس کی کشتی میں بیٹھ گئے۔ یہ کشتی ذرا بڑے سائز کی تھی۔ اس نے پچاس روپے لئے اور کشتی کو لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سمندری کھاڑی میں ساحل کے ساتھ ساتھ ہمیں ڈی پھونگ کے جنگل تک ایک دن کا سفر کرنا ہو گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ہم دن کے پچھلے پہر کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی مختلف جنگلوں اور چٹانی سلسلوں کے قریب سے گذرتی ہوئی جب اپنی منزل پر پہنچی تو رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔

راستے میں 'میں نے برمی ملاح سے جو معلومات حاصل کر لی تھیں' وہ یہ تھیں کہ ڈی پھونگ کے جنگل میں رات کو ہرگز نہ داخل ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہاں سے رنگون کے مہاجرین کا آخری قافلہ تین روز پہلے گذرا تھا جس میں چالیس پچاس کے قریب لوگ تھے۔ ان میں عورتیں' بچے اور بوڑھے مرد بھی شامل تھے۔ تیسری بات اس نے یہ بتائی تھی کہ اگر ہم چاہیں تو اس کے گھر رات بسر کر سکتے ہیں۔ جب ہمارا سفر ختم ہوا اور رات بھی پڑ چکی تھی تو میں نے برمی ملاح سے کہا کہ ہم اس کے گھر رات بسر کرنا چاہتے ہیں' وہ ہم سے کتنے پیسے لے گا۔ برمی ملاح نے تالی بجا کر جو رقم بتائی' وہ بیس

روپے بنتی تھی۔ میں اسے بیس روپے ادا کرنے لگا تو زاہدہ نے مجھے پنجابی میں کہا۔

"پہلے اس کا گھر تو دیکھ لو۔ خدا جانے یہ ہمیں کہاں لے جا کر بند کر دے گا۔"

برمی ملاح شاید زاہدہ کی بات کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔ ہنسنے لگا۔ بولا۔

"ادھر میرا بیوی بچہ رہنے سکتا ہے۔"

اسکا مطلب تھا کہ میرے گھر میں میری بیوی اور بچہ بھی رہتا ہے۔ یہ برمی ملاح جوان آدمی تھا۔ میں نے اسے بیس روپے ادا کر دیئے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اسکا گھر بانس کا ایک جھونپڑا تھا۔ ساتھ ہی بانسوں کو جوڑ کر اور اوپر ناریل کی شاخیں ڈال کر ایک الگ چھوٹی سی جھونپڑی بنا دی گئی تھی۔ فاصلے فاصلے پر کچھ اور جھونپڑیاں بھی گھرے ہوتے رات کے اندھیرے میں دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک کتا بھونکتا ہوا ہماری طرف آیا۔ برمی ملاح نے اسے جھڑک کر دوسری طرف بھگا دیا۔ اس ملاح کی بیوی چپٹے ناک والی ایک دبلی پتلی برمی لڑکی تھی، جس کی صحت عام برمی لڑکیوں جیسی تھی۔ اس نے بچہ گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ ملاح بھی رنگون کے مہاجرین سے پیسے لے کر انہیں رات بسر کرنے کو اپنے ہاں جگہ دیتا رہا ہے۔ انہوں نے ہمیں مچھلی اور چاول کھلائے اور ہمارے سونے کے واسطے ایک چھوٹی جھونپڑی میں بستر بچھا دیا۔ میں نے اپنے برمی میزبان سے چائے کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ اشاروں سے اور کچھ شکستہ لفظوں میں بولا کہ ابھی لاتا ہوں۔ میں اور زاہدہ بستر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں برمی میزبان ہمارے لئے چائے کے دو تام چینی کے مگ لے کر آگیا۔ چائے میں دودھ نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارے ہاں دودھ نہیں ہے؟"

دو تین بار سمجھانے سے وہ سمجھ گیا کہ میں چائے میں دودھ ڈالنے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ ان کے پاس دودھ نہیں ہوتا۔ بکری، گائے، بھینس نہیں ہے۔ میں چائے پینے لگا تو وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"لاتا ہوں۔"

اور وہ مجھ سے میرا چائے کا مگ لے کر جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

زاہدہ بولی۔

"جب ان کے پاس بکری، گائے، بھینس نہیں ہے تو یہ دودھ کہاں سے لائے گا۔"

میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کہیں سے دودھ لا کر اپنے لئے رکھ چھوڑا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ناریل کا دودھ چائے میں ڈال کر لے آئے۔ کیونکہ یہاں ناریل کو کدو کش کر کے اس کا دودھ نکال کر بھی پیا جاتا ہے۔"

برمی میزبان نے کچھ دیر لگا دی۔ میں نے سوچا کہ وہ ناریل کو کدو کش کر رہا ہو گا۔ پھر وہ آگیا۔ چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے دیکھا چائے میں دودھ ملا ہوا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ میں نے زاہدہ سے پوچھا۔

"تمہاری چائے میں بھی دودھ ڈلوا دوں؟۔"

وہ بولی :۔ ''نہیں۔ میں قہوہ ہی پیوں گی۔''

میں نے محسوس کیا کہ دودھ کی وجہ سے چائے کا ذائقہ کچھ غیر مانوس سا ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ کر نہ بولا کہ یہ ناریل کے دودھ کی وجہ سے ہے۔

بہر حال ہم نے رات جھونپڑی میں بسر کی۔ صبح دیر تک سوئے رہے۔ ہماری تھکان کافی حد تک اتر گئی تھی اور توانائی بھی بحال ہو رہی تھی۔ صبح ہمیں چاول مچھلی کا ناشتہ دیا گیا۔ قریب ہی ایک پہاڑی ندی بہتی تھی۔ وہاں ہم نے اپنے کپڑے وغیرہ دھوئے۔ خوب اچھی طرح سے غسل کیا۔ زاہدہ کی پمپی آگے سے پھٹ گئی تھی۔ میزبان برمی ملاح نے خود پمپی بڑے اچھے طریقے سے مرمت بھی کر دی۔ اس کی بیوی زاہدہ کے پاس بیٹھی اپنی زبان میں اور کچھ اشاروں میں باتیں کرتی رہی۔ جب ہمارے کپڑے ہوا میں سوکھ گئے تو ہم چلنے کے لئے تیار ہونے لگے۔ برمی میزبان نے ہمیں بتایا کہ ڈی پھونگ کے جنگل میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ جنگل برما کے مغربی ساحل کا جنگل ہے اور دور سمندر میں جاپانیوں کے جنگی بحری جہاز کھڑے ہیں۔ میں نے پروم کے بارے میں پوچھا کہ وہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ برمی میزبان نے بتایا کہ پروم شہر سے ہم گزریں گے نہیں۔ وہ جنگل کی بائیں جانب کوئی ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر گزر جائے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آگے ہمیں رنگون کے مہاجرین کا قافلہ کہاں مل سکے گا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قافلے کی ایک ٹولی کو یہاں سے گزرے کافی وقت گزر چکا ہے اور پیچھے سے بھی ابھی تک کوئی قافلہ کھاڑی پر نہیں پہنچا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو برمی میزبان اپنا ہاتھ اپنے ہونٹوں کے پاس لے جا کر بولا۔

"چائے پینا سکتا۔"

اور وہ ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا جہاں اس کی نوجوان بیوی بچہ گود میں لئے بیٹھی چائے پکا رہی تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا۔

"چلو ایک ایک مگ چائے کا پی لیتے ہیں۔ معلوم نہیں آگے کب چائے پینا نصیب ہو۔"

ہم جھونپڑی سے کچھ دور اپنی چھوٹی جھونپڑی کے باہر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ برمی میزبان بڑی جھونپڑی کے اندر جا کر تام چینی کے دو مگ لے آیا۔ اس کی بیوی نے کیتلی میں سے چائے کا قہوہ ان میں ڈال دیا۔ برمی میزبان بیوی کو وہاں سے اٹھا کر جھونپڑی میں لے گیا۔ وہاں انہوں نے کچھ دیر لگا دی۔ میں نے سوچا کہ اندر ناریل کدوکش کر کے اسکا دودھ میرے مگ میں ڈال رہے ہوں گے۔

زاہدہ کہہ رہی تھی۔

"ان جنگلوں میں سے ہمیں کب نجات ملے گی؟ کیا میں واپس اپنے ماں باپ کے پاس لاہور پہنچ جاؤں گی؟"

میں نے اسکا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ ہم ضرور انشا اللہ لاہور پہنچ جائیں گے۔ تم نے اس موت کے سفر میں جس بہادری اور جرات مندی کا ثبوت دیا ہے۔ میں اس سے بڑا متاثر ہوں۔"

زاہدہ خاموشی سے دور ناریل کے جھنڈوں کو تکنے لگی۔ اتنے میں برمی میزبان چائے کے مگ لے کر جھوپڑی سے باہر نکلا اور مسکراتا ہوا ہمارے

پاس آگیا۔ اس نے ہمیں گرم گرم چائے کے مگ دیئے اور خود ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میرے مگ میں دودھ ملا ہوا تھا۔ زاہدہ کے مگ میں صرف قہوہ تھا۔ ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے برمی میزبان سے خاص طور پر جاپانیوں کے جنگی بحری جہازوں کے بارے میں پوچھا۔ مگر اسے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اسے اتنا ہی معلوم تھا کہ اکیاب کے سمندر میں ساحل کے قریب جاپانیوں کے جنگی جہاز کھڑے ہیں اور یہاں سے وہ انڈیا کی بندر گاہ کلکتے پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ خبر بھی خاص تشویش ناک تھی۔ اس وقت تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جاپانیوں نے آسام کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے اور کلکتے پر بمباری بھی کی ہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت برمی میزبان کی بیوی بھی بچہ گود میں اٹھائے ہوئے اپنے خاوند کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور یونہی پوچھ لیا کہ چائے میں انہوں نے ناریل کا دودھ ڈالا تھا۔ برمی میزبان ہنسنے لگا۔ نفی میں سرہلا کر بولا۔

"نا۔ ناریل کا دودھ نہیں۔"

"تو پھر یہ دودھ کس کا تھا۔؟"

برمی میزبان نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اسکا دودھ تھا۔"

میں جیسے سکتے میں آگیا۔ اور اسکی بیوی شرما کر جھونپڑی کی طرف چلی گئی۔

زاہدہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اب یہ عورت تمہاری ''رضائی ماں'' بن گئی ہے۔''

میں اپنے آپ میں بڑی شرم محسوس کر رہا تھا۔ نوجوان برمی میزبان نے میزبانی کی انتہا کر دی تھی اور وہ کام کر دکھایا تھا کہ جسکی میں توقع نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال ہم اپنے برمی میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بستی سے رخصت ہو کر قافلے کے راستے پر چل پڑے۔ ہم وادی میں سے گزر رہے تھے۔ یہاں جگہ جگہ تاڑ کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ چاول کے کھیت آ گئے۔ اس کے بعد پھر ویران جنگلی علاقہ شروع ہو گیا۔ جیسے جیسے ہم بڑھتے جا رہے تھے وادی کے کھیت اور پھلدار درخت ہم سے جدا ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ سنبل بانس اور دیودار کے گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہم ڈی پھونگ کے خطرناک جنگل میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے ذہنوں سے جنگلی جانوروں کا خوف کافی حد تک اتر چکا تھا۔ اس جنگل میں ہمیں صرف ایک ہی خوف تھا۔ اور یہ خوف جاپانیوں کا تھا۔ نوجوان برمی ملاح نے بتایا تھا کہ اس جنگل کی دائیں جانب

سمندر ہے اور وہاں جاپانیوں کے جنگی جہاز کھڑے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس جنگل میں جاپانیوں نے اپنے مورچے وغیرہ ضرور بنائے ہوں گے۔

لیکن برمی ملاح کی اطلاع کے مطابق سمندر ہم سے کافی فاصلے پر جنوب کی طرف تھا۔ پھر بھی میں بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا اور اس خطرے سے میں نے زاہدہ کو بھی خبردار کر دیا تھا۔ جاپانیوں کے خیال سے وہ سہمی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے اس نے مجھ سے پوچھا:۔

"کیا ہم جنگل کی دوسری طرف سے نہیں جا سکتے؟۔ شاید ادھر جاپانی نہ ہوں۔ ہم مہاجرین کے قافلے کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں زاہدہ کے خوف کو بخوبی سمجھتا تھا مگر میں اس کی تجویز پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا:۔

"اگر ہم نے یہ راستہ چھوڑ دیا تو جنگل میں بھٹک جائیں گے اور یہ ایسے قاتل جنگل ہیں کہ یہاں ایک بار آدمی راستہ بھول جائے تو پھر ساری زندگی ان جنگلوں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ قافلے کے راستے پر چلتے ہوئے ہمیں کم از کم یہ توقع ضرور ہے کہ ہم بنگال کی جانب ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔"

زاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے سخت گھاس والی اونچی نیچی زمین پر پتھروں اور زمین سے نکلی ہوئی درختوں کی سخت جڑوں سے بچتی میرے ساتھ چلتی رہی۔

ڈی پھونگ کے جنگل میں دو دن تک چلتے رہے۔ دن کو چلتے رہتے اور رات کسی درخت پر چڑھ کر گزار دیتے۔ یہ بڑا قاتل جنگل تھا۔ دن کو کئی جگہ ہم نے ہاتھیوں کے غول جاتے دیکھے۔ لنگور درختوں سے چھلانگیں لگا کر

اترتے اور ہمارا راستہ روک لیتے۔ جنگلی سور بھی ایک جگہ ہم پر حملہ آور ہوئے۔ ہم نے ایک درخت پر چڑھ کر جان بچائی۔ رات کو شیر کے دھاڑنے کی آوازیں بھی آئیں۔ زاہدہ دوڑ کر میرے ساتھ لگ جاتی اور آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دیتی۔ خدا کا شکر ہے کہ دن کے وقت شیر کا کہیں بھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ ہمارے برمی میزبان نے ہمیں تھیلی بھر کر چنے دے دیئے تھے۔ دو دن اسی پر گزارا کیا۔ پانی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پہلا سارا دن پانی کے بغیر گزارا۔ شام کو خوش قسمتی سے ناریل کے کچھ درخت نظر آئے۔ ان کے نیچے تین چار گرے پڑے ناریل مل گئے۔ ان سے پیاس بجھائی۔ ہمارے کپڑے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ میری پتلون اور فلیٹ شوز کا حلیہ زیادہ خراب نہیں ہوا تھا۔ زاہدہ کو اقبال صاحب والی جیکٹ نے بچایا ہوا تھا۔ مگر اسکی شلوار پنڈلیوں پر سے پھٹ چکی تھی۔ تیسرے دن کہیں جا کر جنگل کا گھنا پن آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوا۔ ایک جگہ جنگلی کیلوں کے جھنڈ دکھائی دیے تو ہم دوڑ کر وہاں پہنچے اور کچے پکے کیلے کھا کر پیٹ بھر لیا۔ کیونکہ تھیلی میں چنے بہت کم رہ گئے تھے اور آگے کھانے کو کچھ ملنے کی امید نہیں تھی۔

میں نے ایک کچا ناریل احتیاط کے طور پر چنوں والی تھیلی میں رکھ لیا تھا۔ کیلے کے جھنڈ میں بیٹھ کر میں نے ناریل کو پتھر سے توڑا۔ آدھا پانی زاہدہ کو پلایا۔ آدھا خود پی لیا۔ یہاں گرمی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ زاہدہ دو راتوں سے جاگ رہی تھی۔ درخت پر بھلا کہاں نیند آتی ہے۔ کہنے لگی۔

"میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔"

میں نے اسے سلا دیا اور خود جاگ کر پہرہ دینے لگا۔ جنگل میں سفر کرتے کرتے مجھے اس بات کا بھی تجربہ ہو گیا تھا کہ جنگلی درندے خاص طور پر شیر چیتے وغیرہ دن کو بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ مجھے خطرہ صرف جاپانیوں سے تھا۔ کیونکہ میرے حساب سے ہم پروم کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور جنوبی ساحل سمندر کے قریب سفر کر رہے تھے۔ یہ وہ سمندر تھا جہاں بقول ہمارے برمی میزبان کے جاپان کے جنگی جہاز لنگر انداز تھے۔ مگر ابھی تک جنگل میں جاپانی فوج کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ یہ بڑی خوصلہ افزا بات تھی۔ لیکن کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ اس جنگل میں جاپانی ضرور موجود تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ہم ان سے دور تھے اور ابھی تک ہمارا کسی جاپانی فوجی سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ جنگل میں دن کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں نے ہمارے اوپر سایہ ڈال رکھا تھا۔ یہ کیلے کے درخت تھے اور ایک جگہ جھنڈ کی شکل میں اگے ہوئے تھے۔ ان کے پتے بڑے لمبے اور چوڑے تھے اور اوپر جا کر نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ نیند مجھے بھی آرہی تھی مگر میں سو نہیں سکتا تھا۔

زاہدہ کافی دیر تک سوئی رہی۔ جب بیدار ہوئی تو اس کے چہرے پر تھکان کے اثرات ختم ہو چکے تھے۔ اٹھتے ہی اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا:۔

"میں کتنی دیر سوئی ہوں؟۔"

میں نے کہا:۔

"میرا خیال ہے تم ڈیڑھ دو گھنٹے سوئی ہو۔"

زاہدہ اپنے بالوں کو سمیٹنے لگی۔

"اب آگے کہاں جانا ہے؟۔"

اس نے بے دلی سے پوچھا۔ میں نے کہا:۔

"میرا اندازہ یہی ہے کہ ڈی پھونگ کا جنگل ختم ہو گیا ہے۔ اب آگے اراکان کا پہاڑی سلسلہ آئے گا اور پھر ہم اکیاب کے پاس پہنچ جائیں گے' جہاں سے اگر ہمیں کوئی کشتی مل گئی تو ہم سمندری ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دو تین دنوں میں بنگال کی جنوبی بندر گاہ کاکسز بازار تک پہنچ جائیں گے' جہاں ہمارا یہ جہنمی سفر ختم ہو جائے گا۔"

زاہدہ نے پوچھا:۔

"اکیاب تک پہنچنے میں ہمیں کتنے دن اور سفر کرنا پڑے گا؟۔"

میں نے کہا:۔

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔"

زاہدہ نے مایوسی کے لہجے میں کہا:۔

"لیکن کوئی قافلہ تو ہمیں ملا نہیں۔ کہیں ہم راستے سے بھٹک نہ جائیں۔"

میں نے کہا:۔

"ہو سکتا ہے جو قافلہ آگے گیا ہو' وہ بہت دور نکل گیا ہو۔ پیچھے سے بھی کوئی نہ کوئی قافلہ ضرور آرہا ہو گا۔ ویسے ہم اسی راستے پر جا رہے ہیں' جہاں سے مہاجرین کے قافلے گزرے ہیں۔ فکر نہ کرو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ ہم انشاءاللہ لاہور ضرور پہنچیں گے۔"

زاہدہ خاموش ہوگئی۔ پہلے میں لاہور کا ذکر کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ مگر اب اسکے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے۔

وہ سارا دن بھی بے سروسامانی میں گزر گیا۔ جنگل میں ایک بار پھر ہمیں رات پڑ گئی۔ اب پھر وہی مسئلہ سامنے تھا کہ رات کہاں بسر کی جائے۔ درختوں پر نیند نہیں آتی تھی۔ ساری رات مچھروں اور چیونٹوں سے لڑتے بے آرامی سے گزرتی تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"یہیں زمین پر جگہ بنا کر رات بسر کر لیتے ہیں۔ یہاں کوئی درخت بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کی شاخیں نیچی ہوں۔"

"رات کو شیر آگیا تو کیا ہو گا؟۔"

اس نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔ میں نے کہا:۔

"میرا خیال ہے، ہم گھنے جنگل سے نکل آئے ہیں اور شیر عام طور پر گھنے جنگلوں سے باہر کم ہی نکلتے ہیں۔"

"اور اگر وہ نکل آئے تو؟۔"

میں نے کہا:۔

"تو پھر میں کوئی درخت دیکھتا ہوں جس کی شاخیں اونچی نہ ہوں۔"

ابھی رات کا اندھیرا زیادہ گہرا نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے جنگل کے باہر ابھی شام ہو۔ کیونکہ درختوں کی شاخوں میں سے ڈوبتی شام کی قرمزی جھلک نظر آجاتی تھی۔ میں کسی چھوٹے درخت کی تلاش میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک جگہ چٹان دیکھی جو کافی بڑی تھی۔ اس کے اوپر چٹان کا ایک حصہ

باہر نکلا ہوا تھا۔ میں واپس زاہدہ کے پاس گیا اور اسے لے کر چٹان کے پاس آ گیا۔

"میرا خیال ہے اس چٹان پر رات بسر کی جا سکتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟۔"

زاہدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"میرا کوئی خیال نہیں۔"

"تو پھر میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

ہم چٹان کے اوپر چڑھ گئے۔ چٹان اوپر سے اونچی نیچی تھی۔ یہاں ایک جگہ ہم نے سوکھی گھاس کو توڑ کر سونے کے لئے جگہ بنالی۔ میں نے زاہدہ سے کہا کہ تم سو جاؤ۔ میں جاگتا رہتا ہوں۔ آدھی رات کے بعد بے شک تم جاگ کر پہرہ دینا۔ زاہدہ خاموشی سے چٹان کے بہت بڑے گول پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جہاں میں بیٹھا تھا' وہاں سے مجھے نیچے جنگل کی جھاڑیاں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ جب رات کی تاریکی نے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو یہ جھاڑیاں نظر آنا بند ہو گئیں۔ پھر بھی میں چوکنا ہو کر بیٹھا رہا۔ کسی وقت اٹھ کر چٹان کی چھت پر چکر لگا لیتا کہ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔ یہاں بھی وہی کچھ ہوا۔ یعنی زاہدہ بھی آدھی رات کو نہ اٹھ سکی اور مجھے بھی نہ جانے کس وقت نیند آ گئی اور میں بے سدھ ہو کر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو چاروں طرف دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ راتوں رات وہ بادل جو آسمان پر کئی دنوں سے چھائے ہوئے تھے' غائب ہو گئے تھے۔ میں نے زاہدہ کو اٹھایا۔ ہم چٹان سے نیچے اترے اور اسی راستے پر چلنے لگے' جس راستے پر

چلتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ اب جنگل کی صورتحال یہ تھی کہ کہیں وہ گھنا ہو جاتا اور کہیں چھدرا ہو جاتا۔ درخت جھنڈوں کی شکل میں الگ ہو جاتے۔ زمین میں سے نکلی ہوئی چٹانیں شروع ہو جاتیں۔ پھر یہ چٹانیں آہستہ آہستہ زمین کے اندر غائب ہو جاتیں۔ ہمیں پانی کی تلاش تھی۔ پانی کہیں نہیں مل رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم نے وہ چنے کھا لئے' جو میں نے تھیلی میں سے بچاکر اپنی پتلون کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ ان کی وجہ سے پیاس بھڑک اٹھی۔ ایک جگہ چٹانیں ساتھ ساتھ زمین سے نکلی ہوئی تھیں اور اوپر جاکر ان کے کنارے آپس میں مل گئے تھے۔ ان کے درمیان ایک غار سا بن گیا تھا۔ یہاں پانی گرنے کی آواز سنائی دی تو ہم جلدی وہاں گئے۔

چٹانوں کے درمیان صاف شفاف پانی بہتا دیکھ کر ہمارے چہرے کھل گئے۔ یعنی اس حالت میں جتنے کھل سکتے تھے' کھلے۔ ہم نے وہاں منہ ہاتھ دھویا۔ جی بھر کر پانی پیا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر آگے چل پڑے۔ اب زمین اونچی نیچی ہونے لگی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اراکان کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اچانک گھر گھر کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم جلدی سے ایک طرف بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ گھر گھر کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آسمان پر ایک جہاز نمودار ہوا۔ یہ زیادہ بلندی پر نہیں تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ جہاز کا پیندا بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"زاہدہ! یہ وہ طیارہ ہے جو پانی پر اترتا ہے۔"

"کیا جاپانی آ گئے ہیں؟"

زاہدہ جاپانیوں سے اسقدر ڈری ہوئی تھی کہ طیارے کی آواز سن کر ہی اسکا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ میں نے کہا:۔

"جاپانی تو سارے برما میں موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فلوٹ پلین کہاں اترنے والا ہے۔ یہ جاپانیوں کا ہی طیارہ ہے۔ اسکی بلندی کم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نزدیک ہی سمندر یا سمندر کی کھاڑی ہے' جہاں یا تو جاپانیوں کا کوئی فوجی کیمپ ہے یا اسکا کوئی جنگی جہاز موجود ہے۔"

زاہدہ پریشان ہوگئی تھی۔ کہنے لگی:۔

"جنگل میں کسی دوسری طرف سے آگے چلو۔ یہاں اس طرف جانا ٹھیک نہیں۔"

میری پرابلم یہ تھی کہ میں اس راستے سے نہیں ہٹنا چاہتا تھا' جس پر رنگون سے آنے والے مہاجرین کے قافلے سفر کر رہے تھے۔ اس راستے کو چھوڑ دینے کا مطلب یہ تھا کہ ہم جنگل میں بھٹک بھٹک کر موت کی آغوش میں چلے جائیں۔ صرف مہاجرین کے بنائے ہوئے چھوٹے سے روٹ پر سفر کرنے کی وجہ سے ہم ابھی تک زندہ بھی تھے اور اپنی منزل کے قریب بھی ہو رہے تھے۔ ہمارے زندہ بچنے اور جنگلی درندوں سے ابھی تک محفوظ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس راستے پر انسانوں کی موجودگی کے باعث جنگلی جانوروں نے اس طرف آنا چھوڑ دیا تھا۔ میں زاہدہ کو بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم جس راستے پر جا رہے ہیں' ادھر جاپانیوں کے ملنے کی توقع نہیں ہے۔ آگے اراکان کی پہاڑیاں شروع

ہو رہی ہیں اور جاپانی اگر یہاں ہوں گے بھی تو وہ کسی سمندری کھاڑی یا سمندر میں ہوں گے۔"

ہم نے آگے چلنا شروع کر دیا۔

درخت ایک بار پھر قریب قریب آتے گئے۔ یہاں تک کہ ہمیں جھاڑیوں کو ہاتھوں سے پیچھے ہٹانا پڑ رہا تھا۔ کئی جگہوں پر سے آگے جانے والے مہاجرین نے جھاڑیوں کو کاٹا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کو آگ لگا کر بھی ختم کیا ہوا تھا۔ ایسی جگہوں پر جھاڑیاں جلی ہوئی تھیں۔ یہ راستہ اب ایک چوڑی سی پگ ڈنڈی کی شکل اختیار کر چکا تھا اور جھاڑیوں میں جگہ جگہ چیتھڑے وغیرہ الجھے نظر آ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے خودرو جنگلی جھاڑیوں کا گھنا سلسلہ ختم ہوا۔ آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑی اترائیاں چڑھائیاں آگئیں۔ یہاں سے گذرتے ہوئے ہمارے سانس پھولنے لگے۔ ایک جگہ سانس لینے کے لئے بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ایک آدھ منٹ ہی ہوا تھا کہ ایک بار پھر وہی گھمر گھمر کی آواز آنے لگی۔ زاہدہ ڈر کر بولی:۔

"جہاز بم باری کرنے آ رہا ہے۔"

میں نے اوپر دیکھا۔ اوپر درختوں کی چوٹیاں دور دور تھیں اور آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر مجھے کوئی طیارہ دکھائی نہ دیا۔ گھمر گھمر کی آواز برابر آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز دور ہوتی ہوتی غائب ہو گئی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر یہ طیارہ نہیں تھا تو پھر کس چیز کی آواز تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ جاپانیوں کی کوئی پٹرول بوٹ نہ ہو۔ اسکا مطلب تھا کہ جاپانیوں کا کوئی فوجی کیمپ قریب ہی کسی کھاڑی میں تھا۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"تم اس درخت کے پاس چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں بائیں جانب کے درختوں کے پار جاکر دیکھتا ہوں کہ اس طرف کسی سمندری کھاڑی میں کوئی جاپانی سٹیمر تو موجود نہیں ہے۔"

زاہدہ جنگل میں اکیلی رہ جانے سے گھبرا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے راضی کیا۔ وہ سنبل کے بہت موٹے تنے والے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی اور میں بائیں جانب درختوں کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ درختوں کے نیچے بڑا جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا گیا۔ بائیں جانب جنگلی کیلوں کے درختوں نے دیوار سی بنا دی۔ میں ان کے درمیان سے گذر کر دوسری طرف گیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے سمندر کھاڑی کی شکل میں جنگل کے اندر آگیا ہوا تھا اور کھاڑی میں ایک سٹیمر کھڑا تھا۔ اس پر سرخ دائرے والا سفید جاپانی جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اگرچہ تیز ہو گئی تھی مگر میں یہ معلوم کرنے کے لئے وہاں بیٹھا رہا کہ کھاڑی میں کوئی دوسرا سٹیمر تو نہیں ہے یا پھر اس فوجی سٹیمر میں جاپانی یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔

سٹیمر کے ڈیک پر طیارہ شکن گنوں کی نالیاں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور تین جاپانی سپاہی وہاں کھڑے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کھاڑی کا میری طرف والا کنارہ خالی تھا۔ مجھے انسانوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں وہیں دبک گیا اور آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ کنارے پر ایک طرف سے چھ سات جاپانی سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کی بندوقیں ان کے کاندھوں سے لٹک رہی تھیں۔

اور وہ ایک دوسرے سے اونچی آواز میں باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ کنارے پر آکر وہ رک گئے۔

اسی وقت سٹیمر کا انجن سٹارٹ ہو گیا۔ سٹیمر آہستہ آہستہ کھاڑی کے پانی پر گھومتا ہوا کنارے پر آکر لگ گیا۔ میرا خیال تھا کہ جاپانی سپاہی اس میں سوار ہوں گے اور سٹیمر وہاں سے آگے روانہ ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ سٹیمر میں سے تین جاپانی سپاہی اترے اور کنارے والے سپاہیوں کے پاس آکر ان سے ہاتھ ملائے اور باتیں کرنے لگے۔ پھر وہ کنارے کے ساتھ ساتھ ایک طرف چل دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ جاپانیوں نے اس کھاڑی کے کنارے کسی جگہ اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر یا کیمپ لگایا ہوا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں جلدی سے اٹھا اور واپس دوڑ پڑا۔ اب میں زاہدہ کو لے کر اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اپنی موت کو آواز دے کر بلانا تھا۔ میں جھاڑیوں میں الجھتا اونچی گھاس کو ہاتھوں سے پرے ہٹاتا کیلے کے درختوں کی قطار میں سے نکل کر سنبل کے اس درخت کی جانب بڑھا' جہاں میں زاہدہ کو چھوڑ گیا تھا' تو میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے ایک لمحے کے لئے پتھر کا بت بنا دیا۔

میں نے ایک جاپانی سپاہی کو دیکھا۔ جس نے زاہدہ کو پکڑ رکھا تھا۔ زاہدہ اس سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں حیران ہوا کہ زاہدہ جاپانی سپاہی کو دیکھ کر اس قدر دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ اس کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ جاپانی سپاہی اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور زاہدہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ میرا خون یکدم جیسے کھولنے لگا۔ میں آگے بڑھا۔ پھر رک گیا۔ میں نہتا تھا۔ جاپانی سپاہی کی

رائفل جس کے آگے چھوٹی سی سنگین لگی ہوئی تھی' اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے ہم دونوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔ اس کے ایک فائر کی آواز پر کھاڑی کے سارے جاپانی فوجی وہاں دوڑ کر آ سکتے تھے۔

میرے دماغ میں ایک چکر سا گھومنے لگا۔ میں ساری مصلحتیں بھول گیا۔ زاہدہ کو ہر حالت میں اس جاپانی سے بچانا میرا فرض تھا۔ میں جاپانی سپاہی سے ٹکرا جانے کا جوش و جذبہ لے کر آگے بڑھا۔ مگر پھر رک گیا۔ انسان کو جان کتنی پیاری ہوتی ہے۔ مجھے موت کے خوف اور زندگی سے پیار نے وہیں روک دیا تھا۔ لیکن زاہدہ سے محبت کا جذبہ ایک بار پھر وحشی شکل اختیار کر گیا۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت ہزار درجے بہتر ہے۔ میں ایک بار پھر سنبل کے درخت کی طرف بڑھا۔ اب میں بڑی احتیاط سے قدم قدم جھک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ جاپانی سپاہی اور زاہدہ درخت کے موٹے تنے کے پیچھے ہو گئے تھے اور مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے زاہدہ کی ہلکی ہلکی چیخیں سی سنائی دینے لگیں۔ میں اور نیچے جھک گیا اور پاؤں سمیٹ سمیٹ کر سنبل کے درخت کے تنے کے پاس آ گیا۔

میں نے دیکھا کہ جاپانی سپاہی نے زاہدہ کو زمین پر گرا رکھا تھا۔ وہ اس کے کپڑوں کو نوچ رہا تھا اور زاہدہ بے بسی سے اسے پیچھے دھکیلنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ جاپانی سپاہی کی رائفل درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ زاہدہ پر حملہ کرنے سے پہلے جاپانی سپاہی نے اپنی رائفل درخت کے تنے کے ساتھ لگا دی تھی۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں لہرا گیا۔ یہی ایک طریقہ باقی رہ گیا تھا۔ میرے اندر سے کوئی چھوٹا سا جوالا مکھی اچانک پھٹ پڑا۔ پھر نہ جانے مجھے کس طوفان نے یا کس بگولے نے اپنے حلقے میں لے

کر ایسا چکر دیا کہ میں نے آگے بڑھ کر جاپانی کی رائفل اٹھائی۔ رائفل کے آگے چاقو سے زیادہ بڑے سائز کی سنگین لگی ہوئی تھی۔ جاپانی سپاہی زاہدہ کے اوپر گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ میں جاپانی سپاہی کی پیٹھ پر پے درپے سنگین کے وار کر رہا تھا اور جاپانی سپاہی پہلو کے بل گر گیا تھا اور اس کی خاکی وردی لہولہان ہو رہی تھی۔

زاہدہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے خوف کے مارے کانپ رہی تھی اور مجھے جاپانی سپاہی پر سنگین کے وار کرتے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جاپانی سپاہی کی خون آلود لاش ایک طرف کو جھکی ہوئی گھاس پر پڑی تھی اور اس کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ میں نے رائفل وہیں پھینکی۔ زاہدہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر درختوں کی طرف دوڑ پڑا۔ زاہدہ بھی میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے درختوں میں کافی دور نکل گئے۔ زاہدہ کا سانس پھول گیا۔ وہ پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ میں وہیں کھڑا پیچھے دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی دوسرا جاپانی سپاہی تو ہمارا پیچھا نہیں کر رہا۔ وہ جاپانی نہ جانے کہاں سے اکیلا ہی ادھر نکل آیا تھا اور ایک عورت کو درخت کے پاس بیٹھے دیکھ کر اسکی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ جاپانی سپاہیوں میں سب سے بڑی برائی یہی تھی کہ وہ مفتوحہ علاقے میں گھستے ہی عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے تھے۔

میں نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے زاہدہ سے کہا:۔

”یہاں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں زاہدہ' جیسے بھی ہو' میرے ساتھ چل پڑو۔ کوئی دوسرا جاپانی سپاہی ادھر آنکلا اور اس نے اپنے ساتھی کی لاش

دیکھی تو وہ سارے علاقے کے فوجیوں کو خبردار کردے گا اور ہم پکڑے جائیں گے۔"

زاہدہ یہ سن کر جلدی سے اٹھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں میں جتنی تیز چل سکتے تھے' چلنے لگے۔ کچھ پتہ نہیں ہم کتنی دیر تک چلتے رہے۔ راستے میں ایک ندی آگئی۔ ندی پر کوئی پل نہیں تھا۔ پانی پتھروں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔ زاہدہ ایک بار پھر بیٹھ گئی۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر چلو میں پانی بھر کر پیا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک دہشت کے اثرات تھے۔ کہنے لگی :۔"اگر تم نہ آتے تو میں......"

اور اس نے اٹھ کر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے۔ میرا خیال ہے جب سے زاہدہ سے میری محبت کا رومان شروع ہوا تھا' شاید یہ پہلا موقع تھا کہ زاہدہ کے بازو میری گردن میں حمائل ہوئے تھے۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"خدا نے مجھے عین وقت پر وہاں بھیج دیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ میں نے اس جاپانی کو کیسے قتل کر دیا؟ شاید اس وقت میرے اندر کوئی دوسرا آدمی آگیا تھا' جس نے سنگین کے وار کر کے جاپانی سپاہی کو ہلاک کر ڈالا۔۔۔"

میں نے بھی ندی کا پانی پیا۔ منہ پر چھینٹے مارنے سے مجھے بھی کچھ ہوش سا آگیا۔ پھر ہم نے ندی میں پڑے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھ کر ندی پار کی اور دوسرے کنارے پر جاکر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں اس لئے

وہاں رک گیا تھا کہ یہ فیصلہ کر سکوں کہ قافلے والوں کے راستے سے کتنا پڑے ہٹ گئے ہیں۔ کیونکہ جاپانی سپاہی کو قتل کرنے کے بعد ہم قافلے کے روٹ سے الگ ہو کر سامنے کی جانب کے درختوں کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ قافلے کا روٹ ہماری بائیں جانب رہ گیا تھا۔ میں نے اسکا ذکر زاہدہ سے کیا تو وہ کہنے لگی :۔

"کچھ بھی ہو، ہم واپس اس راستے پر نہیں جائیں گے۔ اس طرف چلتے جاتے ہیں۔ آگے جاکر قافلے والوں کا روٹ مل جائے گا۔"

مگر یہ فیصلہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جنگل میں ایک راستے سے بھٹک کر دوبارہ اس راستے پر آنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ جنگل کا گھنا پن، جنگلی جھاڑیاں اور اونچے نیچے ٹیلوں کی دیواریں اصل راستے کو نگاہوں سے اوجھل کر کے غائب کر دیتی ہیں۔ میں کسی صورت قافلے والوں کے روٹ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس طرف نگاہ ڈالی، جہاں جاپانی سپاہی کی لاش ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اصل راستے سے مشرق کی جانب کافی آگے نکل آئے ہیں۔ اسکا مطلب تھا کہ ہمیں اب شمال مغرب کی طرف چلنا تھا تاکہ آگے جاکر پہاڑیوں میں ہم ایک بار پھر مہاجرین کے قافلوں والے راستے سے جاملیں۔ یہ ایک خیالی اندازہ تھا۔ مگر ہمیں اسی اندازے کے مطابق چلنا تھا۔ میں نے زاہدہ کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا اور ندی کے پار چلتے ہوئے جنگل میں اپنا رخ شمال مغرب کی طرف کر لیا تاکہ آگے جاکر کسی نہ کسی جگہ قافلے کے روٹ پر واپس پہنچ سکیں۔ یہ میری غلطی بھی تھی اور عقلمندی بھی تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہیں تھا۔

ہم نے صبح سے صرف تھوڑے سے چنے ہی کھائے ہوئے تھے۔ ہمارے جسموں پر تکان کے علاوہ نقاہت بھی طاری ہو رہی تھی۔ کیونکہ ہمارے معدے تقریباً خالی تھے۔ موت کا خوف ہمیں آگے ہی آگے چلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یہاں ایک بار پھر ناریل کے درختوں کے جھنڈ آ گئے۔ یہ جھنڈ دوسرے درختوں کے بیچ میں اگے ہوئے تھے۔ ہم جلدی سے ان درختوں کے نیچے آئے۔ یہاں گھاس پر کتنے ہی ناریل گرے ہوئے تھے۔ ہم نے دو تین ناریل توڑے۔ ان کا پانی پیا اور جتنی گری کھا سکتے تھے کھا گئے۔ ہماری کھوئی ہوئی توانائی اتنی بحال ضرور ہو گئی کہ ہم چل سکتے تھے۔ یہاں کوئی باقاعدہ رستہ نہیں بنا ہوا تھا۔ میں اندازے سے مغرب کی طرف چل رہا تھا۔ زاہدہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ ہمارے درمیان ذرا فاصلہ زیادہ ہو جاتا تو میں رک جاتا۔ زاہدہ قریب آتی تو میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے دوبارہ چلنے لگتا۔ میرا خیال ہے ہم کوئی گھنٹہ بھر چلتے رہے ہوں گے کہ ہمیں جنگل میں انسانی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں کافی فاصلے پر ہمارے عقب سے آ رہی تھیں۔ زاہدہ نے یہ آوازیں سنیں تو میرے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بولی:۔

"جاپانی آ گئے ہیں۔"

میں نے اسے اپنے پیچھے کر لیا اور کان لگا کر آوازوں کو سننے لگا۔ اگرچہ آوازیں دور سے آ رہی تھیں مگر بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ یہ جاپانی سپاہی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ساتھی کی لاش دیکھ لی ہے اور اب اس کے قاتل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے جاپانی سپاہی تازہ دم تھے' وہ تیزی سے آ رہے تھے۔ ہم تھکے ہارے انسان تھے۔ ہمیں جنگل کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ میں نے پہلے تو تیز تیز چلنے کا فیصلہ کیا اور زاہدہ کو لے کر بھاگا۔ جنگل

گھنا ہو تو آدمی کیسے بھاگ سکتا ہے۔ جھاڑیوں میں چار قدم بھاگتے اور سامنے کوئی نہ کوئی درخت آجاتا۔ کوئی باقاعدہ پگ ڈنڈی یا قافلے والوں کا روٹ ہوتا تو ہم دور تک بھاگتے چلے جا سکتے تھے۔ مگر اس روٹ سے تو ہم الگ ہو چکے تھے۔

جاپانی سپاہیوں کی آوازیں بھی قریب آرہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ڈبل مارچ کرتے چلے آرہے تھے۔ میں اس بھاگ دوڑ کر میں بھی اپنا رخ مغرب کی طرف برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ہو رہا تھا۔ اچانک ہماری دائیں جانب سے بھی جاپانی سپاہیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ لگتا تھا کہ پوری پلٹن ہماری تلاش میں چلی آرہی ہے اور وہ ہمیں دو جانب سے گھیرے میں لینے کی کوشش میں ہے۔ زاہدہ نے دائیں جانب سے نئی آوازوں کو سنا تو گھبرا کر بولی :۔

"اب کیا ہو گا۔ ہم کہاں چھپیں گے۔ وہ ہمیں پکڑلیں گے۔"

وہ چلتے چلتے ہانپ رہی تھی۔ اس کے الفاظ ٹھیک طرح سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔۔۔

"خدا کے لئے خاموش رہو۔ چپ رہو۔ ہماری آواز انہوں نے سن لی تو مارے جائیں گے۔"

پیچھے اور دائیں جانب سے جاپانیوں کی آوازیں ہر لحظہ ہمارے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ جاپانی زبان میں اونچی اونچی آوازوں میں ایک دوسرے کو کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں اس وقت مجھ پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ میرے ہاتھ پاؤں ایک بار تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ ہم کتنی دور تک بھاگ سکتے تھے۔ جاپانی ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ چند

لمحوں کی بات تھی کہ وہ جھاڑیوں اور درختوں میں سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آجاتے اور ہمیں پکڑ کر لے جاتے یا وہیں شوٹ کر دیتے۔ یقین کریں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے پہلے میری آنکھوں میں اس قیامت کے سفر کے دوران کبھی آنسو نہیں آئے تھے۔ گھبرایا ضرور تھا۔ خوف زدہ ضرور ہوا تھا مگر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ اس وقت میرے جسم پر اچانک ایک کپکپی سی طاری ہوئی اور میرے دل نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ اے رب العالمین! ہمیں ان جاپانیوں سے بچالے۔

اب جاپانیوں کے بھاری بوٹوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ زاہدہ پر تو غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے اسکا بازو تھام رکھا تھا' وہ چلتے چلتے لڑکھڑا جاتی۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے موت کو قبول کر لیا ہے۔ میں اسے تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔ جن درختوں کے نیچے اگی ہوئی جھاڑیوں میں سے ہم گزر رہے تھے' وہ اتنی اونچی تھیں کہ ہمیں آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انہیں میں ایک ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ آواز جاپانی سپاہیوں نے سن لی ہو۔ کیونکہ اسی لمحے جنگل کی خاموش فضا اوپر تلے دو فائروں سے گونج اٹھی۔ یہ رائفل کے فائر تھے۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے شور مچاتے پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ گئے۔ زاہدہ کے حلق سے دہشت زدہ آواز نکلی۔ میں نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ بھگا رہا تھا۔ وہ لٹک سی گئی۔ میں نے دھیمی مگر سخت آواز میں کہا:۔

"زاہدہ! ہوش کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

زاہدہ نے میری آواز سنی تو ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ ایک بار پھر جنگل رائفل کے تیز فائروں سے

گونج تھا۔ اس بار تین چار دھماکے ہوئے۔ میرے منہ کے آگے درخت سے لٹکتی ہوئی ایک بیل آگئی۔ میں نے اسے زور سے جھٹک کر پیچھے ہٹایا تو آگے تھوڑی سی خالی جگہ دکھائی دی۔ یہاں بانس کا چھوٹا سا چھپر پڑا تھا' جس کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ میں زاہدہ کو کھینچتا ہوا قبر کے پاس آیا تو جاپانی سپاہیوں کی آوازیں اتنی قریب سے سنائی دیں کہ لگتا تھا کہ وہ ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔

قبر ایک چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں قبر کے چبوترے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ زاہدہ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ میں نے زاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسکا ہاتھ ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا:۔

"زاہدہ! خدا حافظ! اللہ کو منظور ہوا تو جنت میں ملیں گے۔"

جاپانی سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی دھمک ہمارے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔ اچانک میری نگاہ چبوترے کے ایک پتھر پر پڑی۔ وہ پتھر اپنی جگہ سے کافی باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے پتھر کو باہر کھینچا تو وہ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اب چبوترے میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا تھا کہ ہم اس کے اندر گھس سکتے تھے۔ موت سامنے نظر آجائے تو آدمی جان بچانے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے زاہدہ کو سوراخ کے اندر دھکیل دیا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ سوراخ کے اندر اتنی جگہ ہوگی۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زاہدہ سوراخ کے اندر پوری چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی سوراخ کے اندر گھس گیا۔ میں نے یہ عقلمندی کی کہ سوراخ سے جو پتھر ہٹایا تھا' اسے ہاتھ باہر نکال کر پکڑا اور سوراخ کے آگے کر دیا۔ مگر یہ پتھر پوری طرح سے

سوراخ کے منہ پر نہ آیا اور وہاں کچھ جگہ خالی رہی۔ میں پتھر کو دوبارہ سوراخ کے منہ پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جاپانی سپاہی قبر پر پہنچ گئے۔

میں نے جلدی سے ہاتھ اندر کھینچ لیا۔ اندر کیا تھا۔ یہ کونسی جگہ تھی۔ یہ کیا چیز تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ صرف اتنا احساس تھا کہ ہم زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا اور سوراخ میں سے جہاں پتھر تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا' اندرون کی روشنی آ رہی تھی۔ مجھے جاپانی سپاہی کے بھاری بوٹ دکھائی دیئے۔ وہ قبر کے پاس کھڑا دوسرے جاپانی سپاہیوں کو کچھ کہہ رہا تھا۔ دوسرے سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ وہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر ایسی آواز آئی کہ جیسے کسی جاپانی سپاہی نے قبر پر سنگین ماری ہو۔ یہ آواز اوپر تلے آنے لگی۔ قبر کی مٹی کھودی جا رہی تھی۔ زاہدہ سمٹ کر میرے ساتھ لگی کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے بازو میں لے رکھا تھا۔ خود میرا ڈر کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ دہشت کی وجہ سے میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں ایک ہاتھ منہ کے آگے رکھے ہوئے تھا کہ میرے ہانپنے کی آواز کوئی جاپانی سپاہی نہ سن لے۔

میری خوف زدہ نظریں سوراخ کے پتھر پر جمی ہوئی تھیں اور میرا دل عاجزی سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ ہماری جانیں بچا لے۔ کسی سپاہی کی نظر اس پتھر پر نہ پڑ جائے۔ کیونکہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور وہاں کونے میں کافی خالی جگہ بن گئی تھی۔ ایک جاپانی سپاہی کے فوجی جوتوں والے پاؤں سوراخ سے آگے گزر گئے۔ پھر دوسرے سپاہی کے پاؤں گزرے۔ اوپر قبر کی کھدائی کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ پھر کسی سپاہی نے دور سے آواز دی۔ اس آواز کے جواب میں قبر کے پاس کھڑے سپاہیوں میں سے کسی سپاہی نے اونچی

آواز میں کچھ کہا اور اس کے بعد سارے فوجی' بوٹوں کی دھمک پیدا کرتے وہاں سے چلے گئے۔

خدا نے ہماری دعائیں قبول کر لی تھیں۔ فوجی بوٹوں کی آوازیں جب غائب ہو گئیں اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں نے زاہدہ کے کاندھے پر سے بازو ہٹاتے ہوئے سرگوشی میں کہا:۔

"وہ چلے گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بچا لیا ہے۔"

زاہدہ کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا۔

"ہاں۔"

اب میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا' جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ گھپ اندھیرے میں سے صرف پتھر کے سوراخ میں سے ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا صندوق نما تہہ خانہ ہے۔ اتنا ہی چوڑا اور لمبا تھا جتنی قبر ہوتی ہے۔ صرف دیواریں اونچی تھیں۔ اتنی اونچی کہ ہم اس میں بیٹھ سکتے تھے۔ میں باہر نکلنے لگا تو زاہدہ نے پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر مجھے واپس کھینچ لیا۔

"باہر نہ جاؤ۔ ٹھہر جاؤ۔"

میں وہیں سمٹ کر بیٹھا رہا۔ ہم چپ تھے۔ کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ صرف ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز سن رہے تھے۔ اس تنگ تہہ خانے کی فضا اتنی مرطوب تھی کہ اگر ہٹے ہوئے پتھر کے سوراخ میں سے ہوا اندر نہ آ رہی ہوتی تو ہمارا دم گھٹ جانا یقینی تھا۔ جب پانچ منٹ کے قریب گزر گئے اور جنگل سے جاپانیوں کی آوازیں بھی آنا بند ہو گئیں تو میں نے سرگوشی میں زاہدہ سے کہا:۔

"میرا خیال ہے باہر کوئی جاپانی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہمیں اس کے قدموں کی آواز ضرور آتی۔ میں باہر نکل کر دیکھتا ہوں، تم یہیں رہو۔"

پتھر ہٹا کر سوراخ میں سے میں نے اپنی گردن نکال کر باہر دیکھا خدا گواہ ہے اس وقت میرے دل میں ایک ہی خوف طاری تھا کہ جاپانی سپاہیوں کے پاس تلواریں ضرور ہوتی ہیں۔ ابھی کوئی جاپانی اوپر کھڑا تلوار سے وار کرے گا اور میری گردن کٹ کر دھڑ سے الگ ہو جائے گی۔

مگر باہر کوئی جاپانی سپاہی نہیں تھا۔ سپاہی ہمیں وہاں نہ پا کر جا چکے تھے۔ میں نے سوراخ میں منہ ڈال کر زاہدہ کو کہا کہ باہر آ جاؤ۔ سپاہی چلے گئے ہیں۔ وہ بھی سوراخ میں سے باہر نکل آئی۔ میں نے پتھر دوبارہ لگا کر سوراخ کو بند کر دیا۔ اس تہہ خانے نے ہمیں اللہ کے حکم سے موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔ قبر دیکھی تو وہ ساری ادھڑی ہوئی تھی۔ جاپانی سپاہی کو خدا جانے کیا شک پڑ گیا تھا کہ ہم قبر میں نہ چھپے ہوئے ہوں۔ انہوں نے رائفلز کی سنگینوں سے قبر کی مٹی اکھیڑ ڈالی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی قبر کی مٹی اکٹھی کر کے دوبارہ قبر ٹھیک کر دی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کس کی قبر تھی۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"ہمیں یہاں فاتحہ ضرور پڑھنا چاہئے۔"

ہم قبر کے سرہانے کی جانب بیٹھ گئے اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور قبر کی میت کو ثواب پہنچایا۔ زاہدہ نے کہا:۔

"اب خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔ ہو سکتا ہے جاپانی سپاہی واپس یہاں سے گزریں۔"

زاہدہ کا خیال کسی حد تک ٹھیک تھا۔ میں نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر مغرب کی طرف نگاہ ڈالی۔ ہمیں نقشے کے حساب سے شمال مغرب کی طرف ہی جانا تھا۔

مگر جاپانی سپاہی بھی تقریباً ادھر ہی گئے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دل میں فیصلہ کیا کہ ابھی مشرق کی طرف جنگل میں چلتے ہیں۔ آگے جاکر جہاں جاپانیوں کا خطرہ باقی نہیں رہے گا، دوبارہ اپنا رخ مغرب کی طرف کر لیں گے۔ کیونکہ مجھے بہرحال رنگون کے مہاجر قافلوں کے روٹ کو اختیار کئے رکھنا تھا۔ اسی صورت میں ہم برما کے ملک سے نکل کر بنگال میں داخل ہو سکتے تھے۔ ایک یہ خیال بھی مجھے کسی وقت پریشان کرنے لگتا تھا کہ جاپانی ہندوستان پر بھی یلغار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اگر ہمارے ہندوستان پہنچنے تک وہاں بھی جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تو پھر کیا ہو گا۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا کہ جاپانی ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔ کیونکہ انگریز کسی وجہ سے برما سے بھاگ گیا تھا تو وہ ہندوستان ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ ویسے بھی جاپانی اتنے بڑے ملک ہندوستان پر ایک ہی ہلے میں قبضہ نہیں کر سکتے۔

ہم قبر کے چھوٹے سے احاطے سے نکل کر مشرق کی طرف چلنے لگے۔ احاطے کے پیچھے ہمیں جنگلی کیلوں کا ایک باغ مل گیا۔ یہاں بڑے محتاط ہو کر ہم نے چاروں طرف دیکھا کہ کہیں جاپانی سپاہی نہ چھپے ہوں۔ مگر بظاہر وہاں کوئی جاپانی نہیں تھا۔ ہم کیلوں کے باغ میں داخل ہو گئے۔ جی بھر کر درخت سے کیلے توڑ کر کھائے۔ بھوک مٹ گئی تو آگے چل پڑے۔ ہم دوپہر کے وقت وہاں سے چلے تھی۔ شام جنگل میں اتر رہی تھی کہ ہم چلتے چلتے ایک دریا کے کنارے جا پہنچے۔ پہلے تو میں اسے بھی سمندر کی کھاڑی ہی سمجھا۔ مگر جب قریب جاکر دیکھا تو وہ ایک دریا تھا۔ جنگل میں دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اسکا پانی مٹیالا تھا۔ ہم نے پانی پیا۔ وہ میٹھا تھا۔ اب آگے چلنے کی ہم میں ہمت نہیں رہی تھی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح دریا پار کر کے اس

کے دوسرے کنارے پر رات بسر کی جائے۔ ہمارا وہم تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہم جاپانیوں کی دسترس سے دور ہو جائیں گے۔

سوال یہ تھا کہ دریا کیسے پار کیا جائے۔ وہاں نہ کوئی گھاٹ تھا اور نہ کوئی کشتی ہی نظر آ رہی تھی۔ ہم دریا کے بہاؤ کی طرف کنارے کنارے چلنے لگے۔ دریا کا دوسرا کنارہ کچھ فاصلے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس طرف کے درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ دریا ایک بڑی ندی کی طرح تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ دریا ایک طرف گھوم گیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ مڑے تو ایک موٹر بوٹ کی آواز سنائی دی۔ ہم جلدی سے چھلانگ لگا کر جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ یہ جاپانی موٹر بوٹ تھی، جس پر جاپان کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ ایک جاپانی رائفل لئے پیچھے کھڑا تھا۔ دوسرا جاپانی وھیل کے آگے کھڑا اسے چلا رہا تھا۔ موٹر بوٹ دریا کے اوپر کی طرف جا رہی تھی۔

جب موٹر بوٹ ہمارے آگے سے گزر کر کافی دور چلی گئی تو ہم جھاڑیوں میں سے باہر نکل آئے۔ زاہدہ تھکی ہوئی آواز میں کہنے لگی:۔

"ہم جاپانیوں کے نرغے میں آ گئے ہیں۔"

اسکا خیال سچ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اگر ہم کسی طرح دریا پار کر جائیں تو جاپانیوں سے دور ہو جائیں گے۔ آدمی کے خیال بھی اسے کس کس طرح سے دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے خیال کو میں بالکل صحیح سمجھ رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ دریا کے پار بھی جاپانی موجود ہیں اور وہاں ہم پہلے سے بھی زیادہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"میرا دل کہتا ہے کہ دریا کے پار جاپانی نہیں ہیں۔ آگے ہو سکتا ہے ان کا کوئی بیس کیمپ ہو۔"

"مگر دریا کیسے پار کریں؟ مجھے تو تیرنا بھی نہیں آتا۔"

مجھے تیرنا آتا تھا۔ مگر اتنے تیز بہاؤ والے دریا میں میرے لئے تیرنا ناممکن تھا۔ ویسے بھی دریا کے بہاؤ کو دیکھ کر ڈر آتا تھا۔ میں نے کہا:۔

"تھوڑا آگے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں ماہی گیروں کا کوئی گاؤں ہو۔ اس قسم کے گاؤں دریاؤں کے کنارے ضرور ہوا کرتے ہیں۔"

اب ہم نے دریا کے کنارے سے ہٹ کر جھاڑیوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ یہاں تھوڑا نشیب تھا۔ ایک جگہ دریا کا پانی کنارے کے نیچے سے ہو کر جھاڑیوں میں آگیا تھا اور وہاں ایک نالہ بن گیا تھا۔ ہم نے اوپر سے جا کر نالے کو پار کیا تو ایک عورت کو دیکھا جو سوکھی لکڑیوں کا گٹھا باندھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہاتھ رک گئے۔ میں نے برمی زبان میں اسے سلام کیا۔ اتنی برمی زبان مجھے آگئی تھی۔ پھر اسے برمی زبان میں بہن کہہ کر مخاطب کیا تو اس کے چہرے کی پریشانی دور ہو گئی۔ آگے میری برمی زبان ختم ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ اشاروں اور شکستہ ہندوستانی زبان میں اس سے پوچھا کہ یہاں دریا کہاں سے پار کیا جاتا ہے یا یہاں کوئی گھاٹ ہے۔ عورت نے اشارے سے اور اپنی جنگلی برمی زبان میں مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس عورت میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ اس نے اپنے سر پر نیلے رنگ کا صافہ لپیٹ رکھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ عورت اراکان کی پہاڑیوں میں آباد مسلمانوں کے کسی قبیلے کی تھی۔

وہ ہمیں جنگل کے ایک نیم اندھیرے رستے پر چلاتی ہوئی ایک بستی میں لے آئی۔ یہ ٹیلے کے دامن میں بانس کی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ بستی کے بچے عورتیں اور نیم عریاں مرد ہمیں دیکھ کر ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ اراکان کے مسلمان ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور رنگون سے بھاگ کر آئے ہیں اور بنگال کی سرحد کی طرف پیدل سفر کر رہے ہیں تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھا اراکانی بھی تھا۔ وہ کچھ کچھ ہندوستانی بول لیتا تھا۔ وہ ہمیں اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ اس کی جوان بہو نے ہمارے لئے پانی گرم کیا۔ ہم نے گرم پانی سے اپنے پاؤں دھوئے۔ ہمارے پاؤں چل چل کر سوج رہے تھے۔ بوڑھے مسلمان اراکانی نے کہا:۔

"تم قافلے کے راستے سے بھٹک گئے ہو۔ رنگون کے مہاجروں کے قافلے مغرب کی طرف والے جنگل سے ہو کر جاتے ہیں۔"

میں نے کہا:۔

"ہم قافلے والوں کے پاس کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ کیا دریا پار سے کوئی راستہ ہمیں قافلے کے روٹ تک پہنچا سکے گا؟۔"

پھر میں نے جاپانیوں کے بارے میں پوچھا کہ آگے ان کا کوئی فوجی کیمپ تو نہیں ہے۔ بوڑھے مسلمان اراکانی نے اپنی زبان میں جو کچھ مجھے بتایا' اسکا مفہوم میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ اس کے کہنے کے مطابق ہمیں دریا پار کر کے مغرب کی طرف جانے سے گریز کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس طرف جاپانیوں نے جنگل میں فوجی کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہمیں دریا پار کرنے کے بعد مشرق کی طرف ہو کر آگے جانا چاہئے۔ ایک دن کے سفر کے

بعد ہمیں سیاہ چٹانوں کا سلسلہ ملے گا۔ وہاں سے ہمیں ایک بار پھر جنوب کی طرف رخ کر لینا ہو گا۔ وہاں سے ایک دن کے سفر کے بعد ہمیں مہاجروں کے قافلے کا وہ راستہ مل جائے گا' جو ہمیں اکیاب کی بندر گاہ کے علاقے میں پہنچا دے گا۔ وہاں سے مہاجر لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر تین دن کے سفر کے بعد کاکسز بازار پہنچتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس نے یہ خطرہ بھی ظاہر کیا کہ اکیاب پر بھی جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ سنا ہے وہ لوگ مہاجرین کو کچھ نہیں کہتے اور انہیں آگے جانے دیتے ہیں۔ مگر یہ بھی سنا گیا ہے کہ قافلے میں انہیں جو جوان عورت اچھی لگتی ہے' اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

میں نے یہ ساری باتیں زاہدہ کی بھی گوش گزار کر دیں۔ وہ جاپانیوں کے عورتوں کو اغوا کرنے کا سن کر پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے کہا:۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پہلے ہم اکیاب تک تو پہنچ جائیں' وہاں جا کر دیکھیں گے کہ ہم جاپانیوں سے بچ کر کیسے آگے نکل سکتے ہیں۔"

اس مسلمان اراکانی بستی میں ہم دو دن رہے۔ اسی دوران ہمارے پاؤں کی سوجن بھی جاتی رہی اور ہم اچھی خوراک کھانے سے کسی حد تک تازہ دم بھی ہو گئے۔ یہاں کی مسلمان عورتوں نے زاہدہ کو سوتی کپڑے کا لہنگا اور سوتی کپڑے کی موٹی قمیض بھی پہننے کو دی۔ زاہدہ نے قمیض کے اوپر جیکٹ پہن لی۔ جوتے ان لوگوں کے پاس نہیں تھے۔ ہم نے زاہدہ کی جوتی کو بھی تھوڑا بہت مرمت کیا اور اراکانی مسلمان بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کر کے بوڑھے اراکانی کے ساتھ دریا کی طرف چل پڑے۔

آسمان اس روز بھی صاف تھا۔

خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا گرم تھی۔ بوڑھا اراکانی ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ چونکہ وہ ہندوستانی بول لیتا تھا' اس وجہ سے میں نے اس سے کافی معلومات حاصل کیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جاپانیوں نے خلیج بنگال کے جزائر انڈیمان سمیت تمام جزیروں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہاں بھی ان اراکانی مسلمانوں نے ہمیں تھیلی میں بھنے ہوئے چنے بھر کر دے دیئے تھے۔ ہم دریا کے ایک چھوٹے سے گھاٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں دو تین چھوٹی چھوٹی کشتیاں یعنی سمپان کھڑی تھیں۔ ایک کشتی کا ملاح کشتی کے اندر بیٹھا 'برمی چٹا' پی رہا تھا۔ اراکانی بوڑھے نے اس سے کوئی بات کی۔ ملاح جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اراکانی بوڑھے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ملاح کو دوسرے کنارے پر پہنچ کر دو روپے دے دیجئے گا۔ میں اس بزرگ اراکانی مسلمان سے مصافحہ کرنے لگا تو اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ زاہدہ کے سر پر پیار کیا اور کہا۔

"خدا کرے کہ تم لوگ اپنے گھر پہنچ جاؤ' میں دعا کروں گا۔ میں صبح کی نماز ضرور پڑھتا ہوں۔"

ہم سمپان میں بیٹھ گئے۔ ملاح نے سمپان کی رسی کھولی اور چپو سنبھال لئے۔ کشتی آہستہ آہستہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف رخ موڑنے لگی۔ جب تک ہم نے دریا پار نہیں کیا' مسلمان اراکانی گھاٹ پر کھڑا رہا۔ ہم دوسرے کنارے پر اتر گئے۔ میں نے گھاٹ کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ بوڑھا اراکانی ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا۔ اس کے بعد ہم دریا کے دوسرے کنارے کے نشیب میں اتر کر درختوں میں چل پڑے۔ اراکانی مسلمان نے مجھے جو ہدایات دی تھیں' میں نے اس پر عمل کرتے ہوئے اپنا رخ مغرب کی بجائے تھوڑا سا زاویہ بدل کر مشرق کی طرف کر لیا۔ جنگل میں سفر کرتے ہوئے اپنی سمت کو برقرار رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ پھر بھی میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرا رخ مشرق کی سمت ہی رہے۔ یہ جنگل پہلے والے گھنے جنگلوں سے مختلف تھا۔ یہاں پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں اونچے اونچے پہاڑ نہیں تھے۔ فاصلے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جو جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ڈھلانیں اور نشیب تھے۔ کہیں زمین پر سوکھی گھاس تھی اور کہیں سرخ زمین پر گول گول پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان پتھروں پر بڑی مشکل سے چلا جا رہا تھا۔ ہم کنارے کنارے ہو کر اونچی گھاس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دھوپ کی وجہ سے گرمی محسوس ہو رہی تھی اور ہمیں جلد ہی پسینہ آنے لگا۔

مگر ہم کہیں رکنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے زاہدہ سے ایک جگہ پوچھا بھی کہ اگر وہ تھک گئی ہے' تو ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں مگر وہ جاپانیوں کے خوفناک تصور سے اتنا ڈری ہوئی تھی کہ جتنی جلد ہو سکے' اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پتھریلی زمین ختم ہو گئی تو گھاس والی زمین شروع ہو گئی۔ یہاں چلنے میں آسانی محسوس ہو رہی تھی۔ اراکانی مسلمان نے ہمیں بتایا تھا کہ جنگل میں ایک دن کی مسافت کے بعد سیاہ چٹانوں والا علاقہ آئے گا۔ وہاں سے ہمیں دوبارہ مغرب کی طرف رخ کرنا ہو گا۔ ہم دوپہر تک آہستہ آہستہ قدم قدم چلتے رہے۔ دوپہر کے وقت ہمیں چھوٹا سا ایک پہاڑی نالہ نظر آیا۔ ہم فوراً وہاں بیٹھ گئے۔ ہمارے جسم پسینے میں شرابور تھے۔ ایک دو منٹ تک ہم سانس درست کرتے اور پسینہ خشک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ فضا میں بڑا حبس تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ ہم نے جوتے اتارے اور پہاڑی نالے کے پانی میں پاؤں ڈال دیئے۔ ٹھنڈے پانی نے جسم کو سکون عطا کیا۔ پھر منہ ہاتھ دھویا۔ تھیلی میں سے چنے نکال کر کھائے۔ پانی پیا اور کچھ دیر وہیں بیٹھے رنگون کی باتیں کرتے رہے۔ جاپانی سپاہی کے میرے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد زاہدہ کی نگاہوں میں میرا وقار بڑا بلند ہو گیا تھا۔ میں نے جاپانی سپاہی کے قتل کے بعد محسوس کیا تھا کہ وہ میرا احترام کرنے لگی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بھی میری لئے احترام کا جذبہ نظر آنے لگا تھا۔ پہلے وہ مجھے صرف اپنا ایک عام عاشق ہی سمجھتی تھی جو عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر لاہور سے اس کی خاطر رنگون چلا آیا تھا۔ لیکن اس کی باتوں اور اسکے رویے سے اب یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے ایک ایسا عاشق سمجھنے لگی تھی جو اپنی محبوبہ کی عزت بچانے کے لئے دشمن کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ عورت ایسے عاشق کو صرف پسند ہی نہیں کرتی بلکہ عزت بھی کرتی ہے۔

زاہدہ نے اس کے بعد اپنے مرحوم بوڑھے خاوند کی بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی دل میں اپنے خاوند کی یاد اور احترام ہو، مگر

زاہدہ نے اب اسکا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی، جس نے اسکے خاوند کا غم بھلا دیا تھا۔ انسان جب کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اور غم بھول جاتے ہیں۔

"زاہدہ! لاہور پہنچ کر تم نے زندگی گزارنے کا کیا پروگرام بنایا ہے"

میں نے یہ سوال جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا اس کے دل میں میرے ساتھ زندگی بسر کرنے کا کوئی تصور موجود ہے یا نہیں۔ پہلے تو وہ خاموش بیٹھی پہاڑی نالے کے پانی کو بہتے دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنا سوال دہرایا تو میری طرف نگاہیں اٹھائے بغیر بولی:۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے ابھی یہ بھی یقین نہیں کہ میں لاہور اپنے ماں باپ کے پاس زندہ بھی پہنچ سکوں گی۔"

میں نے اپنے سوال کو کسی دوسرے وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا اور حوصلہ افزا لہجے میں کہا:۔

"کیوں نہیں لاہور پہنچو گی۔ انشا اللہ تم اپنے لاہور والے گھر میں ضرور پہنچ جاؤ گی۔"

"تم بھی تو لاہور پہنچو گے۔"

"کیوں نہیں۔ ہم دونوں لاہور پہنچ جائیں گے۔"

کچھ دیر بعد پہاڑی ندی کے کنارے گھاس پر چھاؤں میں بیٹھنے کے بعد ہم اٹھے اور مشرق کی سمت چلنے لگے۔ کیونکہ آسمان پر بادل نہیں چھائے ہوئے تھے، اس لئے میں نے سورج کا حساب رکھ لیا تھا۔ اس وقت سورج آسمان کا نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا اور آہستہ آہستہ مغرب کی طرف

جھکتا چلا جا رہا تھا۔ اسکی وجہ سے مجھے مشرق کی سمت اپنے زاویے کو برقرار رکھنے میں مدد مل رہی تھی۔ میں اس طرح سفر کر رہا تھا کہ بالکل ہی رخ مشرق کی طرف نہ ہو۔ تھوڑا سا مغرب کی طرف بھی ہو۔ گھنا جنگل پیچھے رہ گیا تھا اور ٹیلے اور میدان سامنے تھے' اس لئے سمت صحیح رکھنے میں مجھے بڑی آسانی ہو رہی تھی۔

ہم ٹیلوں کے پہلو سے ہو کر گزر جاتے تھے۔ ابھی تک ہمیں کسی ٹیلے پر چڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ کوئی ٹیلہ ہماری راہ میں حائل نہیں ہو رہا تھا۔ تیسرے پہر چھوٹے ٹیلے بھی پیچھے رہ گئے۔ ایک بار پھر اونچی گھاس کا میدان شروع ہو گیا۔ زاہدہ نے مشورہ دیا کہ ہمیں ابھی سے رات بسر کرنے کے لئے کسی جگہ کو تلاش کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ابھی کافی دن باقی ہے۔ سامنے جو پہاڑی نظر آ رہی ہے اس کے دامن میں پہنچتے ہی دن ڈوب جائے گا۔ وہاں کسی جگہ رات بسر کر لیں گے۔

سامنے والی پہاڑی کافی فاصلے پر تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ جس سے وادی میں شام کا دھندلکا پھیل گیا۔ آسمان پر سورج کی سنہری روشنی ابھی موجود تھی۔ یہ سنہری روشنی سرخ ہوتے ہوتے قرمزی رنگت اختیار کر گئی۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا زمین پر اترنے لگا۔ اس وقت ہم پہاڑی کے دامن میں آ چکے تھے۔ دوسرے روز کالی چٹانوں کے جس سلسلے کے شروع ہونے کا اراکانی مسلمان بزرگ نے ذکر کیا تھا۔ وہاں ہم اگلے دن کسی وقت پہنچنے والے تھے۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی۔ کیونکہ اس چٹانی سلسلے کو پار کرنے کے بعد ہمیں اراکان کی پہاڑیوں میں داخل ہو جانا تھا' جہاں دو دن تک سفر کرنے کے بعد اگر ہم زندہ

رہے تو ہمیں برما کے شمال مغربی ساحل کی بندرگاہ اکیاب پہنچنا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں جھاڑیاں بھی تھیں اور درخت بھی تھے۔ یہ درخت زیادہ اونچے نہیں تھے۔ شروع رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں وہ مجھے اپنے اوپر جھکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ پہلے تو مجھے پہاڑی میں کسی قدرتی کھوہ کی تلاش ہوئی۔ میں نے زاہدہ کو ایک جگہ بٹھا کر کہا:۔

"میں پہاڑی میں کسی قدرتی کھوہ کی تلاش میں جاتا ہوں۔ کیونکہ کھلی جگہ رات بسر کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ رات کو جنگلی جانور شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

زاہدہ مجھے جانے نہیں دے رہی تھی۔ اسے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اسے ڈر لگنا بھی چاہئے تھا، مگر میرا کسی کھوہ کی تلاش میں جانا بھی ضروری تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف چل پڑا۔ اگرچہ اندھیرا بڑھ رہا تھا مگر آنکھیں جنگل کے اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ دور تک گیا' وہاں مجھے کوئی غار یا کھوہ نظر نہ آئی۔ ایک جگہ مجھے محسوس ہوا کہ پہاڑی کی دیوار میں گڑھا سا پڑا ہوا ہے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو وہ کوئی چار فٹ چوڑی اور اتنی ہی لمبی ایک قدرتی کھوہ بنی ہوئی تھی۔

میں جلدی سے واپس گیا اور زاہدہ کو اپنے ساتھ وہاں لے آیا۔ ہم نے اسی کھوہ میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ زاہدہ نے گرمی کی وجہ سے جیکٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ جیکٹ میں اپنے ہاتھ میں لے کر چلتا رہا تھا۔ کئی بار اسے پھینکنے کا خیال آیا مگر میں نے اسے نہ پھینکا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کو زاہدہ کے نیچے بچھانے کے کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے کھوہ کے

اندر وہی جیکٹ بچھادی۔ زاہدہ اس کے اوپر بیٹھ گئی۔ پانی پیے ہمیں اگرچہ کافی دیر ہو گئی تھی مگر مجھے پانی کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے زاہدہ سے پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ اس وقت پانی کہیں نہیں ملے گا۔ مگر میں تمہیں پانی کی تلاش میں جانے بھی نہیں دوں گی۔ کھوہ کے باہر مچھر ضرور تھے مگر حیرانی کی بات تھی کہ کھوہ کے اندر مچھر نہیں آتے تھے۔ گرمی اور حبس ضرور تھا۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی' فضا میں ٹھنڈک بڑھتی گئی۔ سارا دن چل چل کر ہمیں اتنی تھکان ہو جاتی تھی کہ رات کو جہاں ہمیں پڑ جانے کی جگہ میسر آجاتی' وہیں تھوڑی دیر بعد نیند آجاتی تھی۔ اس کھوہ میں بیٹھے باتیں کرتے کرتے زاہدہ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے اسے سو جانے کے لئے کہا۔ وہ وہیں جیکٹ پر سمٹ سمٹا کر لیٹ گئی۔ کیونکہ اب اسے بھی ان حالات میں راتیں بسر کرنے کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو گئی۔ مجھے بلی کی طرح کے اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے سوچا کہ میں کچھ دیر جاگ کر پہرہ دوں گا۔ مگر میں بھی سخت تھک چلا تھا۔ کچھ دیر ہی گذری ہو گی کہ مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر مجھے بھی ہوش نہ رہا۔

وہ رات بھی گذر گئی۔

دن نکل آیا۔ اس روز بھی آسمان صاف تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ ہم نے ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑے بہت چنے کھائے۔ پانی پیا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اراکانی مسلمان بزرگ نے درست کہا تھا۔ کوئی گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد کالی چٹانوں کی وادی شروع ہو گئی۔ یہ چٹانیں سیاہ نہیں تھیں۔ ان پر کائی جمی ہوئی تھی جس کا رنگ موسموں کی مار کھا کھا کر سیاہ نما گہرا سبز ہو گیا تھا اور دور سے دیکھنے پر سیاہ لگتا تھا۔ یہاں سے میں

نے اپنا رخ مغرب کی طرف کر لیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ ان چٹانوں کی وادی سے گذرنے کے بعد ہمیں رنگون کے مہاجر قافلوں کا روٹ مل جائے گا۔ چٹانوں میں چلنے کی وجہ سے ہماری رفتار سست ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہ چٹانیں بڑی بڑی بھی تھیں اور اتنی چھوٹی بھی تھیں کہ زمین سے چار پانچ انچ باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کئی چٹانوں پر جنگلی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ ان میں چشمے کا پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر تھوڑے سے چنے کھا کر چشمے کا پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ زاہدہ نے پوچھا:۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں ناں۔؟"

"بالکل ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔"

یہاں جگہ جگہ کھجوروں کی طرح اوپر تک گئے ہوئے تاڑ کے درخت اگے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک چھوٹی سی جھیل بھی آئی، جس میں گلابی رنگ کے کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ زاہدہ نے ان پھولوں کو دیکھ کر تھکے ہوئے لہجے میں کہا:۔

"کتنے خوبصورت پھول ہیں۔"

ہم کافی دیر تک چٹانوں کے درمیان چلتے گئے۔ ایک بار پھر درختوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ میں نے سورج کا حساب رکھا ہوا تھا اور اس کو دیکھ کر اپنی سمت کو مغرب کی طرف قائم کیا ہوا تھا۔ دوپہر سے پہلے ایک ایسا مقام آیا جہاں درختوں کے تنوں کے درمیان سے ہمیں پانی کی چمک نظر آئی۔ زاہدہ بے اختیار بولی:۔

"میرا خیال ہے، یہ اکیاب کا سمندر ہے۔"

لیکن مجھے یاد تھا کہ اراکانی بزرگ نے کہا تھا کہ سیاہ چٹانوں کی وادی سے گذرنے کے بعد ہمیں پورے دو دن کے سفر کے بعد جو سمندر ملے گا' وہ اکیاب کا سمندر ہو گا۔ میں نے زاہدہ کو بتایا کہ یہ سمندر نہیں ہے۔ کوئی سمندری کھاڑی ہے۔ چلو آگے چل کر دیکھتے ہیں۔ میں خود بھی اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ مجھے قافلے کے روٹ کی بھی تلاش تھی۔ ہم درختوں کی قطار کے درمیان سے نکل کر دوسری جانب آئے تو دیکھا کہ سامنے ایک بہت بڑے پاٹ والی سمندری کھاڑی تھی' جس کا ساحل بالکل سمندر کی طرح کشادہ اور لمبا تھا۔ درختوں سے کھاڑی کے کنارے تک سفید اور زرد ریت کی کشادہ پٹی تھی۔ یہاں بھی کچھ درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ میں نے زاہدہ سے کہا:۔

"یہ کھاڑی کافی بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیاب کا ساحل سمندر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کھاڑی کے پاس چل کر معلوم کرتے ہیں۔ شاید قافلے والوں کا راستہ وہیں کہیں قریب ہی ہو۔"

ہم دونوں درختوں کی قطار میں سے نکل کر کھاڑی کی ساحلی ریت پر چلتے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تین گھنے درختوں کے قریب سے ہوتے ہوئے وہاں آ گئے جہاں سمندری کھاڑی کا پانی ہلکی ہلکی لہروں کی شکل میں کنارے کی ریت کا منہ دھلا رہا تھا۔ یہاں ریت چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ دھوپ میں کھاڑی کی سطح شیشے ایسی لگ رہی تھی۔ میں نے جھک کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کہیں کوئی روٹ یا ایسا راستہ دکھائی نہ دیا جہاں سے مہاجرین کے قافلوں کے گذرنے کا امکان ہو۔ زاہدہ مایوسی کے انداز میں بولی:۔

"ہم ضرور راستہ بھول گئے ہیں۔"

یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا مگر میں زاہدہ کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:۔

"ہو سکتا ہے آگے جاکر ہمیں قافلوں کا راستہ مل جائے' چلو کھاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

ہم کھاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ دور کھاڑی میں ہمیں ایک چھوٹا بحری جہاز نظر آیا۔ یہ جہاز کھاڑی کے ساحل کی طرف آرہا تھا۔ میں نے گھبرا کر زاہدہ سے کہا:۔

"زاہدہ! یہ ضرور جاپانی جنگی جہاز ہوگا۔"

ہم جلدی سے واپس مڑے۔ مگر اتنی دیر میں جہاز ساحل کے قریب آگیا تھا۔ یہ جاپانی فوجی بوٹ تھی۔ ہم دوڑ کر ان تین درختوں کے پاس آگئے جو ساحل اور کھاڑی کے درمیان ریتلی زمین میں بالکل ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ اب صورت ایسی بن گئی تھی کہ جاپانی فوجی بوٹ اتنی قریب آگئی تھی کہ اس پر کھڑے جاپانی سپاہی نظر آنے لگے تھے۔ اس وقت اگر ہم تین درختوں سے نکل کر جنگل کے کنارے والے درختوں کی قطار کی طرف دوڑتے تو جاپانی یقیناً ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے صورت حال کی سنگینی سے زاہدہ کو آگاہ کرتے ہوئے کہا:۔

"ہمیں ان درختوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو شاخوں میں چھپا دینا چاہئے۔ یہ درخت ٹھیک رہے گا۔ پہلے میں چڑھتا ہوں۔"

اس درخت کی سب سے نچلی ٹہنی مجھ سے کوئی تین فٹ اونچی تھی۔ سب سے پہلے میں نے زاہدہ کو اوپر چڑھا لیا۔ پھر خود بھی چڑھ گیا۔ ہم نچلی شاخوں پر پاؤں رکھ کر درخت کی درمیان والی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

میں کھاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں جاپانیوں کا جنگلی سٹیمر کنارے پر آ کر رک گیا تھا اور اس میں سے چھ سات جاپانی سپاہی ساحل پر اتر آئے تھے۔ جنگی جہازوں کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھی۔ خدا جانے وہ جنگی سٹیمر، گن بوٹ تھی، فریگیٹ تھا یا کیا بلا تھی۔ بہر حال اس میں ایک توپ لگی ہوئی تھی۔ جاپانی سپاہی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے، جہاں ہم چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ درختوں کے نیچے سے گذر کر آگے جنگل کی طرف نکل جائیں گے، مگر وہ ہمارے درخت کے عین نیچے آ کر کھڑے ہو گئے اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آوازوں میں باتیں کرنے لگے اور ایک دوسرے سے مذاق کرنے لگے۔ وہ ہلکے ہلکے قہقہے لگا کر ہنس بھی رہے تھے۔ زاہدہ نے میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ میں بھی خوف زدہ تھا۔ ہماری ذرا سی آواز ان سپاہیوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی اور پھر ہمارا جو حشر ہوتا، وہ ظاہر تھا۔

خدا خدا کر کے یہ جاپانی سپاہی وہاں سے آگے چلے۔ اس دوران فوجی سٹیمر میں سے مزید دو جاپانی سپاہی اتر چکے تھے اور وہ بھی ہمارے درختوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ جس درخت میں چھپے ہوئے تھے، وہ سٹیمر اور جنگل کے درختوں کی قطار کے بالکل درمیان میں تھا۔ پہلے والے جاپانی جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ دوسرے سپاہی ہمارے درختوں کے نیچے پہنچ گئے تھے، مگر وہ وہاں رکے نہیں اور ساحل کی ریت پر چلتے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہماری جان میں جان آئی۔ مگر ابھی مصیبت ہمارے سر پر موجود تھی۔ زاہدہ نے سرگوشی میں کہا:۔ "خدا کے لئے اتر کر بھاگ چلو۔"

میں نے کہا۔ "اگر اس وقت ہم نیچے اترے تو کھاڑی میں کھڑے سٹیمر پر موجود جاپانی ہمیں دیکھ لیں گے۔"

جاپانی جنگی سٹیمر پر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی نگاہیں جنگل کی طرف تھیں۔ وہ بڑی آسانی سے ہمیں درخت پر سے اترتے دیکھ سکتے تھے۔ اب ہمیں اس وقت تک درخت پر ہی ٹنگے رہنا تھا' جب تک سٹیمر کھاڑی سے واپس نہیں چلا جاتا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ جنگل میں جو جاپانی سپاہی گئے ہیں' وہ کب واپس آئیں گے۔ ہم درخت کی شاخوں میں ہی چھپ کر بیٹھے رہے۔ نیچے موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ زاہدہ منہ ہی منہ کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔ میں پتھر بنا بیٹھا تھا۔ کبھی جنگل کی طرف دیکھتا۔ کبھی سٹیمر کی طرف دیکھتا کہ یہ بلا کب یہاں سے ٹلے گی۔

اسی مصیبت میں لٹکے ہوئے شاید آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ پھر اچانک جنگل کی طرف سے جاپانی سپاہیوں کی اونچی اونچی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جاپانی سپاہیوں میں' میں نے ایک بات خاص طور پر دیکھی تھی کہ وہ آپس میں بڑی اونچی آواز میں باتیں کرتے تھے۔ میری نظریں جنگل کی طرف لگی تھیں۔ پھر درختوں کی قطار میں ایک جگہ سے جاپانی سپاہی باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ وہ ساحل کی ریت پر انہی قدموں پر واپس آ رہے تھے' جن قدموں پر وہ جنگل کی طرف گئے تھے۔ جب وہ ہمارے درخت کے نیچے سے گذرے تو میں نے سانس روک لیا' شاید زاہدہ نے بھی سانس روک لیا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے سانس لینے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جاپانی سپاہیوں کی ٹولی آپس میں ہنسی مذاق کرتی ہمارے درخت کے نیچے سے گزر گئی۔ کھاڑی کنارے پہنچ کر وہ ایک ایک کر کے سٹیمر پر چڑھ گئے۔ سٹیمر کا انجن سٹارٹ ہوا

اور پھر پھٹ پھٹ کرتا کھاڑی کے پانی میں مغرب کی طرف چل دیا۔ جب وہ بہت دور چلا گیا تو ہم درخت سے نیچے اتر آئے اور اترتے ہی ہم نے جنگل کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

ایک بہت بڑی مصیبت سے خدا نے ہمیں بچالیا تھا۔ ہم جنگل میں اس طرف بالکل نہ گئے، جدھر جاپانی گئے تھے، بلکہ دوسری طرف چلنے لگے۔ چلتے چلتے ایک بار پھر دن غروب ہو گیا اور جنگل میں شام کا اندھیرا اترنے لگا۔ اب پھر رات گذارنے کا مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔ لیکن اس جنگل میں بعض چٹانیں ایسی تھیں جو زمین سے پندرہ بیس فٹ اونچی تھیں اور اوپر سے چپٹی تھیں۔ ہم ایک چٹان کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے اور خدا کا شکر کرنے لگے کہ ہمیں جاپانیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچالیا تھا۔ زاہدہ کو پیاس لگ رہی تھی۔ کھانے کو چنے تو ہمارے پاس تھے مگر پانی نہیں تھا۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح سے نہیں چھایا تھا۔ مجھے چٹان کے اوپر سے ایک جانب ناریل کے کچھ درخت نظر پڑے۔ میں نے زاہدہ کو وہ درخت دکھائے اور کہا:۔

"میں وہاں سے گرے پڑے ناریل اٹھا کر لاتا ہوں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا:۔

"خدا کے لئے جلدی آنا۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا اور چٹان سے اتر کر ناریل کے درختوں کے نیچے آگیا۔ ان درختوں کے نیچے سے بھی مجھے دو ناریل مل گئے۔ میں انہیں اٹھا کر چٹان کے اوپر لے آیا۔ چٹان پر مار کر انہیں باری باری توڑا۔ ان کا پانی زاہدہ کو پلایا۔ پھر دونوں ناریلوں کی گری ہم کھا گئے۔ وہ رات ہم نے چٹان پر گذار دی۔ دوسرے دن پھر آگے چل پڑے۔ میں اب بالکل مغرب

کی سمت میں چل رہا تھا۔ اس کے نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی دو گھنٹے چلنے کے بعد ہمیں وہ راستہ مل گیا جس پر مہاجرین کے قافلے گزر چکے تھے۔ یہ رستہ جنگل میں انسانوں کے پیدل چلنے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ وہاں ہمیں آس پاس جھاڑیوں میں بکھرا ہوا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی نظر آ گیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہاں سے رنگون سے بھاگے ہوئے لوگوں کا قافلہ گزرا ہے۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے کہ کم از کم ہماری منزل کو جانے والا راستہ ہمیں مل گیا ہے۔ اس روٹ پر ہم سارا دن سفر کرتے رہے۔ درمیان میں کسی جگہ رک کر تھوڑی دیر آرام بھی کر لیتے۔ ابھی سورج غروب ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ جنگل ختم ہو گیا اور ہمیں دور ایک ٹیلے کے پاس ایک اونچی چمنی نظر آئی جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے فرط مسرت سے کہا:۔

"ہرے۔۔۔ زاہدہ معلوم ہوتا ہے ہم اکیاب کے شہر میں پہنچ گئے ہیں۔"

دراصل ہم اکیاب سے ابھی بیس تیس میل پیچھے ایک اور بستی میں تھے۔ لیکن اس بستی میں ہمیں مہاجرین کا ایک قافلہ کھیتوں میں بیٹھا دکھائی دیا۔ لوگ انتہائی خستگی کے عالم میں بے یار و مدد گار وہاں اپنے اپنے بچے کھچے کنبے لئے بیٹھے تھے۔ اکثر ان میں بیمار تھے اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ مقامی لوگوں نے تھوڑا بہت تعاون کیا تھا مگر اکثر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی اس قافلے میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ ہمیں ایک پنجابی فیملی مل گئی۔ انہوں نے ہماری بپتا سنی۔ ہم نے ان کی بپتا سنی۔

معلوم ہوا کہ اکیاب سے ہمیں بنگال کی سرحد کاکسنر بازار تک جانے والی کشتیاں ملیں گی۔ ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے کہ زندہ سلامت وہاں تک پہنچ گئے۔

ہمارے پاس کچھ روپے بچے ہوئے تھے۔ میں جلدی سے بستی کے بازار میں گیا۔ وہاں سے مچھلی اور چاول کیلے کے پتوں میں ڈال کر لے آیا۔ میں نے اور زاہدہ نے وہ سب ایک طرف بیٹھ کر کھایا۔ پانی پیا۔ زاہدہ کے چہرے پر امید کی کرنیں روشن ہوگئی تھیں۔ مگر ابھی کشتی میں کاکسنر بازار تک تین دن کا سمندری سفر باقی تھا۔ اس جگہ دو دن آرام کرنے کے بعد ہم بھی قافلے کے ساتھ اکیاب کی طرف چل پڑے۔ اکیاب ایک مشہور ساحلی شہر تھا۔ وہاں ہمیں جاپانی سپاہی بازاروں میں چلتے پھرتے اور دکانوں میں جھانکتے نظر آئے۔

زاہدہ نے اپنے سر پر دوپٹہ آدمیوں کی طرح باندھ لیا تھا۔ یہ دوپٹہ اور شلوار قمیض قافلے میں شامل ایک پنجابی فیملی نے زاہدہ کو دی تھی۔ میں نے جیکٹ بھی زاہدہ کو پہنا دی تاکہ جاپانیوں کی ہوس ناک نگاہوں سے محفوظ رہے۔ ساحل سمندر پر جو ذیلی بندرگاہ تھی' وہاں سے بڑی بڑی لانچیں لوگوں کو کاکسنر بازار تک لے جا رہی تھیں۔ لانچوں میں مہاجرین کو بھیڑ بکریوں کی طرح بھر دیا جاتا تھا۔ ہر مسافر سے پچاس سے سو روپے تک کرایہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں پچاس' سو روپے کی رقم بہت بڑی ہوتی تھی۔ میرے پاس ڈھائی سو روپے باقی بچے ہوئے تھے۔ میں نے ایک لانچ والے ملاح کو اپنے اور زاہدہ کے پچاس پچاس روپے دیئے تو اس نے کہا۔

"کمتی ہے۔ تمہارا سو سو روپیہ لگے گا۔"

میں نے جیب سے مزید سو روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ ہم بھی دوسرے پریشان حال مہاجرین کے ساتھ لانچ میں بیٹھ گئے۔ اس لانچ میں ایک چھوٹا سا انجن لگا تھا۔ تیل کے تین ڈرم بھی پڑے تھے۔ لانچ جب مسافروں سے بھر گئی تو انجن سٹارٹ کیا گیا۔ اس کا بے حد شور تھا۔ ادھر ادھر جاپانی سپاہی کھڑے یہ تماشا خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ لانچ ساحل سے دور ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد لانچ ساحل سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر سمندر میں شمال کی طرف چلنے لگی۔ راستے میں کیا کچھ گذری' رات کیسے بسر ہوتی تھی' ہم نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح خشک چنے ساتھ رکھ لئے تھے۔ پانی کا انتظام برمی ملاحوں کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ وہ ایک گلاس کا پانچ روپیہ وصول کرتے تھے۔ یہ خلیج بنگال کا کالا پانی تھا۔ سمندر میں طوفان تو نہیں تھا مگر وہ اوپر نیچے ہوتا رہتا تھا۔ لانچ کبھی اوپر اٹھ جاتی اور کبھی موجوں کے ساتھ نیچے ہی نیچے اترتی چلی جاتی۔

تین دن کا یہ سمندری سفر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کسی وقت ایسا لگتا کہ لانچ ڈوب جائے گی۔ مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ لانچ میں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن زندگی کے کچھ دن باقی تھے۔ لانچ آخر کاکسز بازار پہنچ گئی۔ جب لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی گئی کہ وہ ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں تو لوگ خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ کاکسز بازار پہنچ کر پتہ چلا کہ کلکتے پر بمباری ہوئی تھی مگر زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایک بم کلکتے کے مشہور 'بہو بازار' اور ایک 'شام بازار' میں جاپانیوں نے گرایا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے زبردست جوابی حملہ کر کے جاپانیوں کو آسام کی سرحدوں سے بھگا دیا تھا۔

کاکسنز بازار میں رنگون کے مہاجرین کا ایک ہجوم جمع تھا۔ اس وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ حکومت کی جانب سے اور وہاں کے مقامی لوگوں کی طرف سے صرف اتنا انتظام کیا گیا تھا کہ مہاجرین کی دال چاول سے تواضع کی جاتی۔ زخمیوں کو فسٹ ایڈ کیمپ میں لے جایا جاتا اور پھر انہیں ٹرکوں اور بسوں میں ڈال کر چٹا گانگ پہنچا دیا جاتا۔ میں اور زاہدہ بھی دو دن کاکسنز بازار کے کیمپ میں اپنی باری کا انتظام کرتے رہے۔ تیسرے دن ہمیں بھی ایک بڑے ٹرک میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد دیا گیا اور ہمیں چٹا گانگ پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے ایک ریل گاڑی ہمیں کلکتے لے گئی۔ کلکتے سے پنجاب کی طرف سپیشل ٹرین چلائی گئی تھی۔ اس میں کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ یہ صرف رنگون کے مہاجرین کے لئے تھی۔ یہاں سے ہم ایک ریل گاڑی میں بیٹھے اور لاہور پہنچ گئے۔

ہمارے گھر والوں کو ہماری آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اتنی مجھے عقل نہیں تھی کہ کسی سٹیشن سے میں گھر تار بھیج کر اپنی خیریت سے مطلع کر دیتا۔ سب سے پہلے میں زاہدہ کو لے کر اس کے گھر گیا۔ اس وقت دن کے چھ سات بجے تھے۔ زاہدہ کے گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ یہ خوشی اور غم کا ملا جلا کہرام تھا۔ میں نے اس کے بھائی کو رنگون سے پیدل سفر اور زاہدہ کے خاوند کی موت کی مختصر سی روداد سنائی۔ اس دوران ہمارے گھر والوں کو بھی میری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ لوگ بھی زاہدہ کے گھر کی طرف دوڑے۔ مجھے دیکھ کر میری والدہ نے روتے ہوئے مجھے گلے لگالیا۔

گھر پہنچتے ہی مجھے شدید بخار نے آلیا۔ ایک ہفتے تک بستر پر پڑا رہا۔ زاہدہ کے گھر سے کوئی میری خبر لینے نہ آیا۔ والدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس

کے گھر والوں نے اس بات کو اپنی بدنامی پر محمول کیا ہے کہ ان کی بیٹی ایک غیر مرد کے ساتھ رنگون سے پیدل چل کر جنگلوں میں راتیں بسر کرتی لاہور پہنچی ہے۔ میں نے زاہدہ کے ماں باپ کو مسز جمیل کا امرتسر والا ایڈریس بھی دے دیا تھا۔ اتفاق سے مسز جمیل اور جمیل صاحب بھی خیریت سے امرتسر پہنچ چکے تھے۔ ان کے پاس زاہدہ کے کچھ زیور محفوظ پڑے تھے' جو انہوں نے واپس کر دیئے۔

میں ایک دن اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر زاہدہ کے گھر کسی بہانے گیا تو اس کے بڑے بھائی نے مجھے ایک طرف لے جا کر صاف صاف کہہ دیا کہ وہ میرا اپنے گھر میں آنا پسند نہیں کرتے۔ میں شرمسار ہو کر واپس چلا آیا۔ زاہدہ کو انہوں نے گھر میں بند کر دیا تھا۔ اسے گلی والی کھڑکی کے پاس اور چھت پر جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں نے ایک عورت کے ہاتھ اسے ایک خط لکھ کر بھیجا۔ وہ عورت دوسرے دن زاہدہ کا جواب لے کر آئی۔ خط میں زاہدہ نے لکھا تھا:۔۔۔۔

"تم نے میرے لئے جو کچھ کیا' میں اسکا بدلہ شاید ساری زندگی نہ اتار سکوں گی۔ میرے گھر والے احسان فراموش ہیں۔ تم ان کا خیال نہ کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے اتنی محبت نہیں کرتی تھی۔ لیکن جس روز برما کے جنگل میں تم نے میری عزت بچانے کے لئے جاپانی سپاہی کو ہلاک کر ڈالا تھا' بس اسی روز سے میرے دل میں تمہاری محبت نے ایک گہرا نقش بنا دیا۔ مگر میں اپنے ماں باپ کی عزت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ شاید

تمہیں معلوم نہ ہو' میرے گھر والے مجھے میری خالہ کے پاس لدھیانہ بھیج رہے ہیں۔ جہاں میری شادی کی بات میرے خالہ زاد کے ساتھ پکی کر دی گئی ہے۔ اس آدمی کے پہلے ہی چار بچے ہیں' جو جوان ہیں۔ کاش میں تمہاری طرح لڑکا ہوتی۔ مگر میں لڑکی ہوں اور اپنے ماں باپ کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی۔ لیکن میرے دل کو تمہاری محبت کا' تمہاری جدائی کا ابھی سے غم لگ گیا ہے۔ لگتا ہے میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گی۔ میری جان! اگر میں مر گئی تو مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم ایک بار میری قبر پر آ کر میری روح کی بخشش کے لئے فاتحہ ضرور پڑھو گے۔

تمہاری غم زدہ!

زاہدہ------"

میں خط پڑھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ زاہدہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی تھی اور میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود آوارہ گرد اور بیکار تھا۔ نہ کوئی نوکری تھی' نہ معاش کا کوئی ذریعہ تھا۔ کالج چھوڑ کر زاہدہ کے پیچھے رنگون بھاگ گیا تھا۔ اگر کہیں نوکر بھی ہوتا تو وہ لوگ زاہدہ کی شادی میرے ساتھ کبھی نہ کرتے۔ اس کے بھائی پہلے ہی میرے خلاف تھے اور اب میری وجہ سے بقول ان کے' ان کی رشتے داروں میں سخت بدنامی ہوئی تھی کہ زاہدہ ایک غیر مرد کے ساتھ رنگون سے پیدل سفر

کر کے لاہور پہنچی ہے۔ مجھے زاہدہ کے رشتے داروں اور دنیا والوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

اس عورت نے مجھے ایک روز بتایا کہ اگلے ہفتے زاہدہ کو لدھیانہ لے جایا جا رہا ہے، جہاں جاتے ہی اسکی شادی کر دی جائے گی۔ میرے کلیجے پر سانپ سا لوٹ گیا، مگر میں بے بس تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دو دن دیوانوں کی طرح لاہور کے لارنس گارڈن میں پھرتا رہا۔ اس زمانے میں باغ جناح کا نام لارنس گارڈن ہوا کرتا تھا۔ تیسرے دن اچانک یہ خبر سنی کہ زاہدہ سخت بیمار ہے اور اسے میو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ میں اس کی خبر لینے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دل زاہدہ کی جدائی میں خون کے آنسو روتا تھا۔ ایک دن میں نے سوچا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں زاہدہ کا حال معلوم کرنے میو ہسپتال میں پہنچ گیا۔ بر آمدے میں مجھے زاہدہ کے دونوں بھائی پریشان حال کھڑے دکھائی دیئے۔ میں قریب گیا تو بڑے بھائی نے مجھے ایک طرف دھکا دے کر غصے میں کہا:

"اگر پھر یہاں آئے تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں سر جھکا کر واپس مڑ گیا۔ میو ہسپتال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے وہی عورت ملی جو زاہدہ کے گھر میں کام بھی کرتی تھی اور میرے خط پتر بھی لے کر جایا کرتی تھی۔ وہ لفافے میں دوائیاں ڈالے جلدی جلدی آ رہی تھی۔ میں نے اسے روک کر پوچھا:

"زاہدہ کا کیا حال ہے؟"

عورت فکر مند دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی:

"دعا کرو۔ تمہاری دعا ہی رب سنے گا جی۔"

اتنا کہہ کر وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دل سے بار بار زاہدہ کے لئے دعا نکلتی۔ لگتا تھا اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ واپس گھر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ میں لارنس باغ کی طرف نکل گیا۔ شام تک وہاں زاہدہ کی یاد میں ایک درخت کے نیچے اداس بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو واپس گھر کی طرف چل پڑا۔

گلی میں داخل ہوا تو زاہدہ کے گھر کے آگے لوگوں کو اکٹھے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ذرا قریب آیا تو زاہدہ کے گھر سے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ حلق خشک ہو گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیسے اپنے گھر پہنچا اور کب چارپائی پر بیٹھ گیا اور میں نے بہن سے پانی مانگا۔ گھر والے میرے اور زاہدہ کے رومان سے واقف تھے۔ معلوم ہوا کہ زاہدہ مر گئی ہے۔ میں پچھلی کوٹھڑی میں جا کر اونچی اونچی آواز میں اتنا رویا کہ گھر والے پریشان ہو کر کوٹھڑی میں دوڑتے ہوئے آگئے اور بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے سنبھالا۔

میں سب سے اپنا آپ چھڑا کر گھر سے باہر گلی میں نکل آیا اور مجھے آج بھی یاد نہیں کہ میں کس طرح فیض باغ والے اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ اتنا یاد ہے میرے دوست نے میری صورت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ میں اس سے لپٹ کر رونے لگا:۔ "زاہدہ مر گئی ہے' دوست۔۔۔ ہاں مر گئی۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔۔۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لے گیا۔ وہ رات میں اپنے دوست کے پاس ہی رہا۔ اس نے میرے گھر پیغام بھجوا دیا کہ میں اس کے پاس فیض باغ میں ہوں۔ دو دن اور دو راتیں میں اپنے دوست کے گھر پر ہی

رہا۔ اپنی گلی میں جانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اب وہاں کوئی زاہدہ کھڑکی کی چق اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھے گی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے اور میں اپنے دوست کے ساتھ لگ کر بچوں کی طرح رونے لگتا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ وہ معلوم کرے زاہدہ کو قبرستان میں کس جگہ دفن کیا گیا ہے۔

"میں اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں' یہ زاہدہ کی بھی خواہش تھی۔"

میرے دوست نے واپس آکر بتایا کہ زاہدہ کو ریلوے لائن والے قبرستان میں ہی دفن کیا گیا ہے۔

"میں وہ جگہ بھی دیکھ آیا ہوں' جہاں اسکی قبر ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم فیض باغ سے نکل کر ریلوے لائن پر آگئے۔ آگے وہی قبرستان تھا جہاں گرمیوں کی دوپہر کو میں اور زاہدہ ایک بار ملے تھے۔ میرا دوست قبرستان میں داخل ہونے کے بعد مختلف قبروں کے درمیان سے گذرتا ہوا مجھے زاہدہ کی قبر پر لے آیا۔ جب میں زاہدہ کی قبر پر آیا تو مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔۔۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں میں اور زاہدہ ایک بار ملے تھے اور قبروں کے درمیان بیٹھ کر گرمیوں کی دوپہر میں دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ زاہدہ کی قبر بھی عین اسی جگہ پر بنی تھی' جہاں وہ اس روز میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں زاہدہ کی قبر سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے دوست نے مجھے اٹھا کر حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ جب رونے سے میرے دل کا بوجھ ذرا

ہلکا ہوا تو میں نے فاتحہ پڑھ کر زاہدہ کی روح کو ثواب پہنچایا اور قبر کی طرف دیکھ کر کہا:۔

”اچھا دوست! اللہ نے چاہا تو اب اگلے جہان میں ضرور ملاقات ہوگی۔“

اور میں اپنے دوست کے کاندھے پر ہاتھ رکھے بوجھل قدم اٹھاتا قبرستان سے باہر آگیا۔

☆☆☆

اے حمید کے نئے سفرنامے

وینس کی سلگتی راتیں

وینس کی نہروں والی گلیوں میں کشتیاں چلانے والوں کے دل گداز گیت سننے اور حسن کی دیوی، سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی وینس کی تلاش میں مصنف اٹلی جا پہنچا، جہاں جگمگاتی روشنیوں کے پیچھے بے خواب راتیں سلگتی ہیں-----!

قرطبہ کی خاموش اذانیں

ہسپانیہ (موجودہ سپین) کا ایسا دلگداز، دلچسپ سفرنامہ جس میں ہمیں اگر رومانس کی اٹکھیلیاں ملتی ہیں تو ایڈونچر بھی اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہ روایتی افسانوی انداز بھی لئے ہوئے ہے اور مسلمانوں کے عظیم الشان اور شاندار مگر گمنام باب کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

رنگون سے فرار

برما کا یہ سفرنامہ مصنف کے ایسے عشق لازوال کی داستان ہے جو قارئین کو مدتوں یاد رہے گا--- اور برما پر جاپانی قبضے کے بعد رنگون سے کلکتے تک پیدل سفر کی ہولناک سچی داستان بھی ہے۔

پیرس کے تاریک اجالے

ماڈرن پیرس کی رنگین راتوں، مچلتے اندھیروں اور سلگتی محفلوں میں جھانکتا ہوا ایسا سفرنامہ جس کی ایک ایک سطر قاری کے ذہن کو کیف و مستی کی نرالی دنیا میں لے جاتی ہے......!